تیر و نشتر

اسلام کو جاہلیت سے ممیز کرنے اور غیر اسلامی عقائد
و اعمال کی اصلاح کا انقلاب انگیز سامان

اور

دین حق اور اس کی جزئیات کا حقیقت افروز مُرقع

از

مولانا نصر اللہ خاں عزیز بی اے مدیر "کوثر" لاہور

مُرتّبہ

محمد شریف قریشی



مکتبہ دین و دنیا نزد تھانہ گوالمنڈی لاہور

محمد شریف قریشی نے مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ لاہور
سے چھپوا کر کامیاب بک ڈپو نزد تھانہ گوال منڈی لاہور
سے شائع کیا

بار اوّل قیمت عہ

اُن طالبانِ حق کے نام!

جو

اسلام کی روشنی میں اپنی زندگی کا صحیح نقشہ مرتب کرنے کے
آرزومند ہیں

جبکہ

دعوتِ اسلامی کا غلغلہ بلند ہو چکا ہے نظامِ باطل
کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر خدا کی زمین پر نظامِ حق قائم کرنے کی
تحریک جاری ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کے معاشرے میں
جاہلیت کی آمیزشوں کی نشان دہی کی جا رہی ہے۔
اور غلط دینداری اور فریب خوردہ پرہیزگاری اور
غفلت و خود فراموشی کا پردہ چاک کیا جا چکا ہے۔

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عذرِ گناہ

"تیر و نشتر" کا تصور فی الواقع ہراس انگیز ہے۔ تیر دل و جگر میں پیوستہ ہو جاتا ہے۔ اور نشتر رگِ جاں کو قطع کر سکتا ہے!۔ اور آدمی جب ان دو لفظوں کو سنتا ہے۔ تو معاً اس کے دل میں یہ خیال گذرتا ہے کہ یہ تو کوئی بڑی ہی خطرناک چیزیں ہیں لیکن تیر و نشتر کا یہ بالکل سطحی تصور ہے۔ ان کا حقیقی تصور دلفریبی اور احساس کا ہے اگر آپ کوئی بات کسی شخص کے دل میں اتارنا چاہتے ہیں۔ تو آپ کو اسے تیر و نشتر کے پیرایۂ بیان میں پیش کرنا چاہیئے!۔ چنانچہ جب اخبار "مسلمان" میں جوابات "کوثر" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ بہرۂ تیر و نشتر کا اضافہ کیا گیا۔ تو پیش نظر یہی نفسیاتی اور طبعی حقیقت تھی۔

جب زندگی کا نظام بگڑ جاتا ہے۔ اور اس نظامِ زندگی پر ایمان لانے والے چھلکے پر فدا اور مغز سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔ تو سیدھی سادی نصیحت و اعظ کے وعظ

کی طرح نہ صرف خشک اور بے مزہ ہوتی ہے۔ بلکہ تاثیر کے اعتبار سے بھی بیکار ہو جاتی ہے۔ لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پکار سنتے ہیں۔ مگر اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ اس کے مخاطب دوسرے لوگ ہیں۔ اس وقت دعوت حق کو تیر و نشتر کے انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ لوگ براہِ راست اسکی خلش کو محسوس کریں اور سمجھیں کہ اس کا تخاطب ہم سے ہے۔

اگر آپ کسی مجلس میں حاضرین سے مخاطب ہو کر یہ فرمائیں کہ نماز قائم کرو۔ کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ رسول کا ارشاد ہے۔ ائمہ صادق کی نصیحت ہے اور دین حق کا ایک اہم رکن ہے۔ تو بے نماز سے بے نماز شخص اس قول کو سُنے گا۔ اور محسوس تک نہیں کرے گا۔ کہ یہ بات اس سے کہی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ آپ اس کی طرف بڑھیں گے۔ اس کی پسلیوں میں ایک ٹھوکا دے کر کہیں گے کہ حضرت، میں آپ کی خدمت میں یہ گذارش کر رہا ہوں۔ اس وقت وہ محسوس کرے گا کہ فی الحقیقت ادائے نماز کی تلقین کا روئے سخن اس کی طرف ہے۔ ادبی اور صحافتی زبان میں اس طریق تبلیغ کو تیر و نشتر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اور اسکی ضرورت اس وقت ہوتی ہے۔ جب قوموں کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ علی الخصوص ان قوموں کا جو خدا کے دین کی حامل اور امین ہوتی ہیں۔ اور اپنی اس خصوصیت کے باعث نجات و سعادت کی اجارہ دار بن جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک خوب و ناخوب کا معیار خود ان کا قول و فعل ہو جاتا ہے۔ وہ جو کام بھی کرتی ہیں۔ خواہ وہ دین حق کے کتنا ہی مخالف ہو۔ اسے وہ عین حق تصور کرتی ہیں ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

قرآن مجید میں اس قسم کی قوموں کی مثال کے طور پر بنی اسرائیل کو پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کے افکار و عقائد اور اعمال و اقوال کی اصلاح ان کو براہ راست دین حق کی دعوت دینے، اور کتاب الٰہی کو معیار حق بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر ایسا پیرایۂ ارشاد اختیار کیا ہے۔ جس پر یہود کے علماء اور عوام ضرور تلملا جاتے ہونگے۔ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ یہ استفسار ایک قسم کا نشتر ہے جو یہودیوں کی دینی غفلت کے پھوڑے پر چلایا گیا ہے۔ اسی طرح یہود اور نصاریٰ اس وہم باطل میں مبتلا تھے کہ محض یہودی اور نصرانی کے نام سے منسوب اور ان قوموں میں پیدا ہونے کے باعث وہ نجات یافتہ ہیں۔ خدا کے محبوب اور فرزند و لپسندیدہ ہیں۔ اور اگر ان کے اعمال بد کی پاداش میں انہیں عذاب میں جھونکا بھی گیا تو بس چند روز کے لئے اور اس کے بعد وہ عذاب کی کٹھالی میں سے کندن کی طرح پاک و صاف و چمکتے ہوئے نکل آئیں گے۔ اس قسم کے اوہام کے لئے مجرد یہ ایمان کافی نہیں ہوا کرتا۔ کہ یہ سب سرد پا ہیں۔ بلکہ ذرا زیادہ زور کی ضرب لگانی پڑتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے غفلت و خود فراموشی کے پردے کو چاک فرمانے کے لئے یہ ارشاد کیا۔ کہ فلم یعذبکم بذنوبکم۔ اگر تم خدا کے

لاڈلے اور فرزند دلبند ہو تو تمہارے گناہوں کی پاداش میں تمہیں اللہ تعالیٰ عذاب میں کیوں مبتلا کرتا ہے۔ اور یہ ایک واقعہ تھا۔ کہ یہود و نصاریٰ پر گناہوں کے باعث مصائب و آلام کی بارش ہوتی تھی۔ پھر فرمایا تم نے یہ کہاں سے سن لیا کہ تمہیں آگ صرف چند روز کے لئے مس کرے گی۔ کیا تمہارے پاس اس قسم کی کوئی دستاویز ہے۔ اگر ہے۔ تو ذرا پیش تو کرو۔

آج مسلمانوں کو ـــــ جو کتاب الٰہی کے حامل اور شریعت حقہ کے امین ہیں غفلت و خود فراموشی، فریب خوردگی اور غلط قسم کی دینداری سے باہر نکالنے کے لئے جد و جہد کرتے ہوئے جہاں دوسرے ذرائع تبلیغ و دعوت استعمال کئے جاتے ہیں۔ وہاں تجربے نے ثابت کیا ہے۔ کہ "تیر و نشتر" کی قسم کی تنقید بھی مفید ہے چنانچہ گزشتہ کے "تیر و نشتر" جن کا ایک تیر و جگر دوز انتخاب اس کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے اپنی افادیت کے لئے ایک معتبر شہادت رکھتے ہیں۔

"تیر اور نشتر" کے الفاظ سنکر گھبرائیے نہیں۔ تیر وہی نہیں ہوتا۔ جو قدیم زمانے میں تیر اندازوں کی کمان سے نکل کر دشمن کے سینے میں پیوست ہو جاتا تھا۔ بلکہ تشکیک و ارتیاب اور عقلیت و لا ادریت کے بادلوں کو چھانٹنے کے لئے بھی جو چیزیں کارگر ہوتی ہیں۔ ان کو بھی تیر و نشتر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی اپنے مضمون "میری محسن کتابیں" میں مثنوی مولانا روم کے متعلق

لکھتے ہیں :-

"طبیعت بیقرار کہ کمرہ بند کیئے بس اسی کو شروع سے آخر تک پڑھتا چلا جاؤں - ہر ہر شعر تیر و نشتر بن کر دل کے اندر پیوست ہوتا جاتا - اور "تشکیک وارتیاب عقلیت ولا ادریت کے بادل ایک ایک کر کے سب چھٹتے چلے جاتے ہیں"

اسی طرح مولانا مناظر احسن گیلانی اسی موضوع پر مضمون لکھتے ہوئے امام غزالی کی احیاء العلوم کا تذکرہ کرتے ہیں - اور کہتے ہیں کہ :-

" دوسروں کو وعظ سنانے کے لئے کتاب کھولی تھی لیکن معاملہ دوسرا ہوا ، غزالی کی ہر سطر مجھ پر تیر و نشتر کا کام کرنے لگی اور سے

شد غلامے کہ آب جو آرد

آب جو آمد و غلام ببرد

اور دل جواب تک گونگا بہرا بنا ہوا سینے میں سویا ہوا تھا تڑپ اٹھا۔"

یعنی تیر و نشتر کی خاصیت اصلاح و انقلاب ہے۔ یہ کام یہ "تیر و نشتر" کر چکے ہیں - اس سے قبل وہ منتشر تھے - اب ان کو یکجا کر دیا گیا ہے - اب یہ ایک "ترکش" ہے اور ایک "نشتر کدہ" ، ان کا مقصد دل آزاری نہیں بلکہ اصلاح و دعوت ہے ۔ اس "گناہ" کے بارے میں ------ اگر اسے گناہ کہا جائے ---- لیں یہی ایک عذر ہے کہ مقصد دین حق اور اس کی جزئیات کی وضاحت اور عبرت انگیزی اور سبق آموزی ہے - تاکہ لوگ محسوس کر سکیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں

اس کی حیثیت خدا کے دین کی رو سے کیا ہے۔ حق و صدق کا معیار ایک ہی ہے اور وہ ہے کتاب و سنت، اس کے سوا جو کچھ ہے اوہام و اباطیل کا مجموعہ ہے اور ہمیں اپنے تمام اعمال و عقائد کو خدا کے دین کی کسوٹی پر ہی پرکھنا چاہیئے۔ ہماری مصلحتیں۔ ہمارے تجربے ہمارے نظریئے۔ ہمارے مقاصد ہمارے خیالات ہماری دانست کا نیک و بد ـــــ کسی کی کوئی حقیقت نہیں۔ زندگی کا صحیح نقشہ صرف اسلام پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے باطل ہے ان الدین عند اللہ الاسلام ـــ اور ـــ ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخسرین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

نصر اللہ خاں عزیز

شیطان کا دھوکا

ہمارے ایک تقویٰ فروش بزرگ کو اصرار ہے کہ موجودہ نظام باطل سے تعاون واشتراک اور اس کی خدمت واعانت نہ صرف جائز ہے بلکہ اس کے صلے میں جو روپیہ ملتا ہے وہ بھی حلال وطیب ہے اور بعض لوگ ان الحکم الا للہ کا حوالہ دے کر خواہ مخواہ اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ خدمت باطل سے الگ ہو کر خدمت حق کرنے کے لئے نکل آؤ۔ ان کا خیال ہے کہ اگر آدمی نماز پڑھتا رہے۔ زکوٰۃ دیتا رہا۔ تہجد ادا کیا کرے اور اوراد ووظائف سے تزکیہ نفس کرتا رہے اور اپنی باقی زندگی رائج الوقت غلط کافرانہ اور باطل نظام کی خدمت کر کے معاش بھی حاصل کرتا رہے تو اس کے تقویٰ پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ اس خیال کو ثابت کرنے کے لئے وہ نجدہ خارجی اور اور سلمہ بن الاکوع تابعی کے تعلقات سے سند بھی لاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر انسان نماز خدا کی پڑھے اور خدمت شیطان کی کرے تو یہ بات توحید کے خلاف کیونکر ہوئی۔

لیکن ان بزرگ کو یہ سن کر ضرور وحشت ہو گی کہ سلف صالحین موجودہ عہد کے کفار وفجار کے چلائے ہوئے نظاموں کی خدمت تو درکنار اپنے زمانے کے مسلمان سلاطین وامراء کے قرب وتعلق کو بھی خطرے کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ حضرت سفیان الثوریؒ حضرت عباد بن عباد کو ایک مکتوب میں

لکھتے ہیں :-

"تم امیروں تک قریب جانے یا کسی معاملے میں ان کے ساتھ میل جول رکھنے سے بچو۔ اور اس سے بچو کہ تم کو یہ کہہ کر دھوکا دیا جائے کہ تم امیروں کے پاس اس لئے جاتے ہو کہ کسی کی سفارش کرو گے۔ کسی مظلوم کی مدافعت کرو گے۔ یا کسی کا حق دلواؤ گے۔ کیونکہ یہ سب شیطان کا دھوکا ہیں۔"

اسلامی حقوق کی نگہداشت کے لئے نظام باطل کی خدمت اور اس سے تعاون کو درست قرار دینے والے "کوثر لاہوری" کی نہیں مانتے تو کیا "سفیان ثوری" کی بھی نہ مانیں گے۔

"مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"

ایک صاحب کو اس بات کی بڑی کاوش ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کے لئے نظام باطل کی خدمت اور تعاون کو جائز بلکہ مستحسن ثابت کر دیا جائے۔ اس سعیٔ لاحاصل میں وہ اس بدحواسی کے ساتھ تگ و دو فرما رہے ہیں کہ بقول اکبر مرحوم ان کی پتلون تو خیر مگر جبہ و دستار ضرور لنگوٹی بنے جا رہے ہیں سہ

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنون کو اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

یہ حضرت کبھی اطاعت حق کے لئے والدین کی نافرمانی کو خارجیت قرار دیتے ہیں۔ اور کبھی خود خارجیت کو واجب الاطاعت فرماتے ہیں۔ کیا

کریں حق کو ناحق ثابت کرنے والے آدمی کا یہی حال ہوتا ہے۔

ان کا تازہ شاہکار استدلال یہ ہے کہ نجدہ خارجی نے جب قوت پاکر مسلمانوں سے صدقات (محصولات) وصول کرنے شروع کئے تو حضرت سلمہ بن الاکوع سے کہا گیا کہ آپ اس سے کنارہ کشی کیوں نہیں کر لیتے۔ (یعنی اس کے حدود اقتدار سے باہر کیوں نہیں ہو جاتے) تو ارشاد ہوا میں کنارہ کشی کروں گا۔ نہ اس کی بیعت کروں گا ــــــ اس کے بعد اپنا صدقہ اسی کے حوالے کر دیا۔

اس واقعہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ موجودہ نظام باطل کی ملازمت بھی حلال و جائز اور اس کی کمائی بھی حلال و طیب ہے۔ حالانکہ اگر بغیر کسی کھینچ تان کے کوئی حقیقت حضرت سلمہ کے فعل سے مترشح ہوتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ نظام باطل اگر غالب ہو جائے تو ایک مومن کا طریق کار تعاون نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ اس کی بیعت سے انکار کر دے از راہ فرار اختیار کر کے اپنی جان بچا لینے کے بجائے اس کے اندر رہ کر اپنی عدم اطاعت کا اعلان کرے اور اس کو الٹ دے۔ باقی رہا محصولات کا سوال۔ تو جب تک باطل کی حکمرانی قائم ہے اس وقت تک دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ کے مصداق محصولات کو اس کے حوالے کرنا ہی پڑے گا ــــــ اللہ اکبر کہاں یہ طرز عمل اور کہاں وہ نتیجہ کہ مومن باطل کی خدمت اور چاکری کرے۔ اس کے قیام و استحکام میں آلۂ کار بنے اور اس خدمت کے صلے

میں چند ٹکے وصول کرے اور اسے زہر مار کر کے اپنی ریش مقطع پر ہاتھ پھیر کر پڑھے الحمد للہ کیسا حلال وطیب مال حاصل ہوا۔

اگر ہمارے تقویٰ فروش بزرگ اسی قسم کے استدلال سے تعاون علی الاثم والعدوان کی حمایت کرتے رہے تو حق تو خیر باطل بھی الامان پکار اٹھے گا کہ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔

جدید حکایتِ لقمان

حکایاتِ لقمان میں ایک جانور بیان کیا گیا ہے کہ اس نے ایک انسان کو دیکھا جس نے گرم چیز کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بھی منہ سے پھونکیں ماریں اور ہاتھوں کو گرم کرنے کے لئے بھی گرم گرم سانس استعمال کیا۔ اس پر اس نے کہا کہ جو شخص گرم اور سرد دونوں صورتوں میں ایک ہی طرز عمل اختیار کرتا ہے وہ دوستی اور اعتماد کے قابل نہیں۔ یہ کہہ کر وہ آدمی سے الگ ہو گیا۔

آج اس ہمہ گیر غلبۂ باطل کے زمانے میں بھی ہمیں کچھ ایسے ہی ناقابل اعتماد مدعیانِ حق سے سابقہ پڑ رہا ہے جو نظامِ باطل اور نظامِ حق کیساتھ معاملہ کرنے میں ایک ہی طرز عمل اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نظامِ حق کو بھی واجب الاطاعت اور مستحق تعاون سمجھتے ہیں اور اپنے غرور تقویٰ کو یہ کہہ کر بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں کہ جب باطل غالب آجائے تو مسلمان کو اس

کی بھی اطاعت کرنی چاہیئے۔ اس سے بھی تعاون کرنا چاہیئے۔ اس کی گاڑی کو بھی منہ بنا کر کھینچنا چاہیئے۔ خدا بلاشبہ ہماری اطاعتوں کا حقدار ہے۔ لیکن جب شیطان ہماری گدی کا نائب ہے تو بیشک اس کے سامنے بھی جھکا دینی چاہیئے۔ حق بہت اچھا ہے۔ باطل بہت برا۔ مگر دونوں واجب الاطاعت ہیں۔ دونوں کی خدمت جائز ہے۔ گردن جھکانے سے غرض ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ شیطان کے سامنے جھک رہی ہے یا خدا کے سامنے۔

نوکری

آپ کسی شریف پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے آدمی سے کہیئے کہ میرے یہاں نوکری کر لیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ آپ کو کیا جواب دیتا ہے۔ وہ اس کو اپنی شرافت اور مرتبہ کے خلاف اور اپنی سخت توہین سمجھے گا۔ کسی شخص کی نوکری کرنا۔ اس کے گھر کا کام کاج کرنا۔ اس کا سودا سلف بازار سے لانا۔ اس کے بچوں کو کھلانا اور بہلانا۔ اس کے لیے چلم بھر دینا ——— کس قدر ذلت کی بات ہے۔ ایک شریف آدمی اس ذلت کو کیونکر گوارا کر سکتا ہے؟

صحیح ارشاد ہوا مگر یہ تو فرمائیے کہ آج ہندوستان میں چند لوگ ظالم باطل کی چاکری کر رہے ہیں۔ اس کی خدمت کر کے تنخواہیں وصول کر رہے ہیں۔ اور اس کو اپنی عزت و توقیر اور سامان فخر تصور کرتے ہیں۔ ان کے متعلق

کیا رائے ہے، کیا صرف شخصی نوکری۔ چلم بھرنا۔ سودا سلف لا دینا۔ بچوں کو بہلانا یہی ذلت کے کام ہیں۔ اور ایک ایسے نظام کی خدمت کرنا اور اس کے کاروبار کو چلانا اس کی ضروریات کو مہیا کرنا عزت کا باعث ہے؟ علی الخصوص جبکہ وہ نظام، خدا کا باغی، شریعت سے بے نیاز، ہماری مرضی سے ماوراء اور عدل وحق کے خلاف ہو؟ ——— باطل کی کامیابی یہ نہیں کہ وہ غلبہ حاصل کر کے جسموں کو اپنے کام میں لگائے۔ بلکہ یہ ہے کہ دل و دماغ کو بدل ڈالے۔

قول وعمل

شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے سکھ ووٹروں کی فہرست مکمل کرنے کے سلسلے میں کمونسٹ سکھوں کو نام درج کراتے ہوئے اس شرط کی پابندی کرنے کے لئے حکم دیا کہ ایک تو ہر شخص کو حلفیہ بیان دینا ہوگا کہ میں سکھ ہوں، دوسرے تمباکو اور سگریٹ نہیں پیتا، تیسرے شراب نہیں پیتا، چوتھے نہ ڈاڑھی کٹواتا ہوں نہ منڈواتا ہوں۔ گویا سکھ مذہب کے یہ اساسی مطالبات ہیں۔ اور ان میں سے بجز پہلے کے باقی ایسے ہیں جو ہمارے ہاں کتنے ہی متقی حضرات پورے کر رہے ہیں۔ کتنا سیدھا سادھا مسلک ہے۔ دو چار منفی اعمال کے ساتھ یہ اعلان کر دینا کہ میں سکھ ہوں آپ کو آزاد چھوڑ دیتا ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں جو رویہ چاہیں اختیار کریں

ان بنیادی امور کے سوا اور کسی چیز پر سکھ نظامِ جماعت آپ سے باز پرس نہ کرے گا۔

لیکن مسلمان تو ان سکھوں سے بھی چار قدم آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے ہاں اسلام کے بنیادی مطالبات تک پر پوچھ گچھ نہیں ہوتی۔ ان کی سب سے بڑی جماعت کے دفتر میں جاکر صرف یہ کہیے کہ آپ مسلمان ہیں تو پھر آپ اس کے رکن ہی نہیں بلکہ صدر تک بن سکتے ہیں۔ یہ تین لفظ کہنے کے بعد کہ "میں مسلمان ہوں" آپ چاہیں تو اسلام کے ہر عقیدے سے اور ہر حکم پر "تین حرف" بھیجیں، کون مائی کا لال آپ پر انگلی اٹھا سکتا ہے۔

سکھوں نے تو قول کی تصدیق کے لئے پھر بھی کچھ اعمال تجویز کیے ہیں مگر آپ کے ہاں تو قول کی تصدیق عمل سے کرنے کا دستور ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ آپ کی جماعتی تاریخ قول و عمل کے تضاد کی تاریخ ہے۔

ترقی کا زمانہ

۱۲ ربیع الاول کو بمبئی کی مجلس منتظمہ عید میلاد النبیؐ کے اہتمام میں ہر سال ایک جلسۂ عام منعقد ہوتا ہے جس میں مسلمان صداقتِ رسولؐ و حقانیتِ اسلام پر تقریریں کرتے ہیں اور غیر مسلم پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں نذرِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ امسال بھی یہ جلسہ خاص تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوا۔ ایک مسلمان ریاست کے مسلمان دیوان نے صدارت

کے فرائض سرانجام دیئے۔ ایک نہایت سلجھا ہوا اور بصیرت افروز خطبہ پڑھا۔ جس میں مسلمانوں کو اسوۂ حسنہ رسول کی پیروی کی تلقین کی گئی تھی۔ اور مقررین نے جن میں مسلمان پارسی اور سکھ حضرات شامل تھے۔ ہادی کائنات کے محاسن و فضائل بیان کیے۔

مگر جلسے کے اس تبلیغی اور عملی پہلو کے مقابلے میں عملی پہلو یہ تھا۔ کہ اس کا آغاز ۳ بجے بعد دوپہر کو ہوا اور اختتام ساڑھے سات بجے ــــــ عصر کی نماز اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کرنے والوں نے اس طرح صاف اڑا دی کہ گویا فرض ہی نہ ہوئی تھی ــــــ یہ ہے طول و عرض ہماری تبلیغ اسلام کا اور یہ ہے عملی حقیقت ہماری عقیدت رسول کی جس پیغمبر نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا تھا۔ اس کا یوم ولادت اس شان سے منایا گیا کہ صلوٰۃ وسطیٰ الامان والحفیظ پکار کر رہ گئی۔

تاہم اس غفلت و بے خبری میں کارکنان جلسہ کو اس امر کا خاص اہتمام رہا کہ صدر اور دوسرے معززین کی جلسے سے اٹھ کر تصویر کھچوالیں محشر امروہی نے اس موقع پر اپنی نعت کے مقطع میں خوب کہا ؎

اس ترقی کے زمانے کے تصدق محشر عید میلاد پہ تصویر بھی کھچوائی ہے

یوم النبی کے پروگرام کی یہ تصویر کچھ بمبئی کے لئے خاص نہیں ہے تقریباً ہر مقام پر مسلمانوں نے محبت رسول کا ثبوت اسی طرح مخالفت رسول کے ذریعہ دیا۔ جلوس نکالے گئے تو ان کے آگے آگے بینڈ بجائے گئے سرود

اور قوالی کی محفلیں گرم کی گئیں اور نمازیں ہضم کر کے اعلان کیا گیا کہ اس ترقی کے زمانے میں عشق رسول میں ان دقیانوسی چیزوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ——— اسلام کی تبلیغ اور تذکار نبی کا یہ نیا اڈیشن ہے مسلمانوں کو حیرت ہوتی ہے کہ غیر مسلم اسلام کی صداقت کا اعتراف کیوں نہیں کرتے اور ہمیں مسلمانوں پر حیرت ہے کہ وہ ترکستان کی طرف منہ کر کے چلتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ حج بیت اللہ سے مشرف ہو جائیں گے۔

تبلیغ اسلام

مسٹر سنجانہ (بمبئی) نے اچھوتوں کو مشورہ دیا تھا کہ "وہ عیسائیت کو قبول کر لیں جس کے پیرو دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قومیں ہیں" اس پر ایک دوسرا شخص ذیل کی دلچسپ رائے زنی کرتا ہے۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر خداوند یسوع مسیح آج اس گناہگار دنیا میں کہیں تشریف لے آئیں اور دیکھیں کہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے کرتک اور اعمال کیا ہیں تو وہ لرزکر پکار اٹھیں کہ کیا یہ ہے وہ مسیحیت اور عیسائیت جس کی تبلیغ میں نے ان لوگوں کے اسلاف اور بزرگوں کے سامنے کی تھی؟ اور جس کے لئے میں سولی پر لٹکایا گیا تھا۔ خدا ان لوگوں سے بچائے"

مذہب اور اہل مذہب میں جب عملی تضاد حد سے بڑھ جاتا ہے تو مذہب کا بالکل وہ حال ہوتا ہے جو اوپر کی سطروں میں بیان کیا گیا ہے جب

اس کی طرف دنیا کو دعوت دی جاتی ہے تو لوگ پکار اٹھتے ہیں کہ تم جو اس مذہب کے پیرو ہو اس نے تم میں کیا تغیر پیدا کیا ہے کہ ہمیں اس کی طرف دعوت دے رہے ہو۔

عیسائیت ہو یا ہندو دھرم یا اور کوئی مذہب ان کی جو صورتیں کتابوں میں بھی باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں بھی کوئی دلکشی نہیں ہے لیکن اسلام نہ صرف تعلیمات کے اعتبار سے ایک معین صورت میں موجود ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے اسوۂ حسنہ کی صورت بھی باقی ہے۔ اور مسلمانوں سے قطع نظر دنیا کو براہ راست اسلام کی طرف بلایا جا سکتا ہے۔ پھر بھی مسلمانوں اور حقیقی اسلام میں جو فرق پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اسلام کی راہ قبول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر آج دنیا اسلام سے محروم ہے تو قصوروار غیر مسلم نہیں بلکہ پیروئ اسلام کے غلط کار مدعی۔

دو ٹنگے جانور

"کھیل ایک بنیادی جذبہ ہے۔ جو پوری حیوانی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ اور بہرحال ہم انسان دو ٹنگے جانور ہی تو ہیں"

ان الفاظ میں مسٹر ہنری لال سیکرٹری پنجاب سپورٹس ٹورنامنٹ کمیٹی نے ورزشی کھیلوں کی اہمیت کو ایک اخبار نویس کے سامنے واضح کیا۔

"ہم سب جانور ہیں" یہ بات سن کر بعض لوگ مسکرا دیں گے۔ اور بعض

بگڑ جائینگے کہ سیکرٹری صاحب نے یہ کیا کہہ دیا۔ مگر اپنی حالت پر غور کیجئے۔ جانور اور کسے کہتے ہیں۔ جانور بھی صرف اپنے جسم کو درست رکھنے کے لئے کھیلتے ہیں۔ بچھڑے کودتے ہیں۔ گدھے لوٹتے ہیں۔ ہرن قلانچیں لگاتے ہیں۔ بندر ناچتے ہیں۔ ان کے سامنے صرف جسم کی اصلاح اور من کی خوشی ہوتی ہے۔ اور آج کا انسان کس لئے کھیلتا ہے۔ کس لئے کودتا ہے۔ کس لئے ناچتا ہے۔ کس لئے ڈنٹر پیلتا ہے۔ کس لئے تیرتا ہے۔ صرف جسم کی درستی اور من کی خوشی کے لئے، پھر اگر آپ جانور نہیں تو اور کیا ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جانوروں کی بالعموم چار یا زیادہ ٹانگیں ہوتی ہیں۔ اور آپ کی صرف دو ہیں۔ ورنہ مقصد حیات کے اعتبار سے کیا فرق ہے۔ قرآن مجید میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ الذین یاکلون کما تاکل الانعام۔ جو لوگ دین حق کے منکر ہیں۔ وہ اس طرح کھاتے ہیں۔ جس طرح جانور کھاتے ہیں۔ حرام و حلال۔ جائز و ناجائز۔ نیک و بد کی کوئی تمیز نہیں۔ مقصد پیٹ بھرنے سے ہے کیا یہی صورت موجودہ دور کے معاشی حیوان کی نہیں ہے؟ اگر آپ جانور کہلانا نہیں چاہتے۔ تو پہلے زندگی کا مقصد متعین کیجئے۔ اور پھر اسی کے لئے کھیلئے اسی کے لئے کمائیے۔ اسی کے لئے کھائیے۔



۷ر جنوری ۱۹۵۶ء کو جالندھر کے ایک تھانے میں ایک خوبصورت دوشیزہ

حسن و جمال کے چہرے پر غیظ و غضب کا غازہ مل کر حاضر ہوئی اور شکایت کی کہ ایک روز شام کو میں دفتر سے اپنے فرائض ملازمت سرانجام دے کر واپس آ رہی تھی کہ ایک نوجوان نے سامنے آکر کہا نمستے۔ لیکن میں نے اس نمستے کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس پر اس نے ایک ہاتھ سے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے بمشکل اس سے اپنا بازو چھڑایا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ شخص کہیں پھر مجھ سے مذاق نہ کرے۔ اس لئے اس سے نیک چلنی کی ضمانت لی جائے۔

پولیس نے اس بدحواس اور وارفتہ شوق نوجوان کو بلایا۔ لیکن اس نے جواب دیا کہ جس وقت کا ذکر لڑکی کر رہی ہے۔ اس وقت تو میں اپنے دفتر میں تھا ——— پولیس شش و پنج میں ہے کہ حقیقت واقعہ کیا ہے۔ نہ "حسن" کے اقرار میں شک کر سکتی ہے۔ نہ شوق کے انکار کا جواب دے سکتی ہے۔

نمستے کا یہ واقعہ نوجوان دنیا کا پہلا واقعہ نہیں۔ ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور ابد تک ایسا ہی ہوتا جائے گا۔ جب عورت حرم کی مقدس چار دیواری میں رہ کر تقدیر امم کو اپنے ہاتھوں سے ڈھالنے کی بجائے حصول معاش کی وادیوں میں دوڑنے والا بے بس پرزہ بن جائے گی۔ تو اس کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ کہ اسے نمستے کہا جائے۔ یا آداب عرض کیا جائے۔ اگر سوسائٹی آگ سے گرمی۔ پانی سے تری۔ ہوا سے سبکی اور خاک سے خشکی نکال سکتی ہے۔ تو خوبصورت بے حجاب عورت سے دلآویزی اور نوجوان مردوں سے شوق کی بے اختیاری بھی نکال سکتی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یورپ کی طرح عورتیں نمستے کہنے پر ساتھ

ہو لیں۔ اور ٹھانے میں جانے کی بجائے ہوس کی راہ لیں۔ ہندوستان کی سوسائٹی کے سامنے بھی دونوں راہوں میں سے ایک راہ کھلی ہوئی ہے۔ یا تو عصمت کو موتی تصور کرے اور عورتوں کو حجاب میں رکھے۔ یا پھر عصمت و عفت کو ٹھیکری سمجھے اور سر بازار اچھالتی پھرے۔

"وزیر مالیات"

یو۔ پی کا ایک اخبار نویس حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ان کے حاسد بھائیوں نے ان کو کنوئیں میں ڈالا۔ پھر ایک قافلہ ان کو لیکر مصر چلا گیا۔ پھر خاندان ابراہیمؑ کا یہ گوہر شب چراغ غلاموں کی منڈی میں شاہ مصر کے ہاتھوں فروخت ہوا۔ اور آخر میں لکھتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے دل پر دنیا جہاں کے حکمران کی بادشاہت کا نقش جما تھا۔ اس کے عمل کا یہ صلہ خدا نے دیا کہ وہ اس سلطنت عظمیٰ کا فنانس منسٹر بن گیا۔

اللہ اکبر! خلیل اللہ کے پڑپوتے، یوسف صدیق۔ رسول ابن رسول ابن رسول ابن رسول علیہم السلام کے مقام و مرتبہ کی یہ کتنی حیرت انگیز تعبیر ہے۔ گویا جس مرد حق کی خدا پرستی کا یہ عالم تھا۔ کہ عنفوان شباب میں بھی اس کے دل پر صرف اللہ کی بادشاہت کا نقش ثبت تھا۔ اس کے ایمان و یقین کا بڑے سے بڑا صلہ جو دنیا جہان کے حکمران نے عطا فرمایا۔ وہ یہ تھا کہ اسے مصر کے بادشاہ کا وزیر

مالیات بنا دیا۔ آہ! حضرت یوسفؑ پر نہ ظلم ان کے بھائیوں نے کیا۔ اور نہ زنانِ مصر نے بلکہ ان جدید مفسرینِ قرآن نے جو ایک جلیل القدر نبی کو ایک معمولی بادشاہ کا وزیر بنا کر پھولے نہیں سماتے۔

ایک بادشاہ کا وزیر خواہ اس کی کوئی حیثیت ہو۔ وہ وزیر مالیات ہو یا وزیراعظم اس سے زیادہ نہیں کہ وہ اپنے تمام اعمال و افعال کے لئے اپنے بادشاہ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات ایک نبی تو درکنار ایک معمولی مگر صحیح مسلمان کی شان سے بھی بعید ہے۔ کہ وہ خود کو اللہ احکم الحاکمین کے سامنے جوابدہ سمجھنے کی بجائے ایک ایسے انسان کے سامنے جوابدہ قرار دے لے۔ جو خدا کی شریعت اور ہدایت سے بھی آگاہ نہیں۔ ہمارے دوست لفظ وزیر سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ جس طرح ہمارے لئے ایک وزیر بڑا آدمی ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک نبی بھی اگر کسی بادشاہ کا وزیر بن جائے تو گویا اس کی بڑی قدر افزائی ہوئی۔ مگر وہ "جوابدہی" کے اصول کو بھول جاتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ ایک نبی جو اللہ سے براہ راست ہدایت حاصل کرتا ہے کسی انسان کے سامنے جوابدہی کی مجبوریاں کیونکر قبول کر سکتا ہے۔

"مالِ مفت، دلِ بے رحم"

یہ سرخی سرمے کے ایک اشتہار کی ہے۔ جس میں نصیحت کی گئی ہے کہ آنکھ کی قوت کو مالِ مفت سمجھ کر ضائع کرنے والوں کو ہوش سے کام لینا چاہئے۔

اب ذرا انہیں الفاظ کی معنویت کو وسعت دے کر بھی دیکھئے۔ آپ کو جان دی گئی، اعضاء دیئے گئے، احساس دیا گیا، شعور دیا گیا ـــــ بغیر اس کے کہ آپ کو کوئی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اور آپ ہیں کہ ان قیمتی نعمتوں کو بچا بچا کر اپنے مقصدِ حیات پر صرف کرنے کی بجائے یونہی لٹاتے پھرتے ہیں۔

ہر کافر فسادی کے ہاتھ آپ کی جانیں بکتی ہیں، ہر ملعون شیطان کے پاس آپ کا دماغ گروی ہو سکتا ہے، ہر خر متکبر کے پاس آپ کے اعضاء کی بیع ہو جاتی ہے، ایک ذرا ذرا سے آرام کے لئے آپ کی خودی بک جاتی ہے۔ ایک چھوٹی سے چھوٹی مسرت کے لئے آپ کا ایمان دوسروں کے قبضے میں چلا جاتا ہے ــ ـــــ یہ ہے "مالِ مفت، دلِ بے رحم" کی سب سے دردناک تفسیر!! ـــــ مگر یاد رکھئے کہ ان امانتوں کے استعمال کا محاسبہ ہونے والا ہے۔

جدید بازارِ عکاظ کے مبلغ

لیجئے خدمتِ باطل کے جواز کا ایک اور دروازہ کھلا!

"جہلائے اسلام" فرماتے ہیں کہ ہم اگر حکومتِ باطل کے کالجوں میں اور اس کے محکموں میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں کونسی قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ درانحالیکہ خود انبیاء شاہی درباروں اور بت خانوں میں گئے ہیں اور نبیِ عربی کا عکاظ جیسے پلید میلے میں تبلیغ اسلام کے لئے جانا ثابت ہے۔

سنا آپ نے یہ نظامِ حرام کو چلانے کی تربیت حاصل کرنا اور اس کی

نوکری کرنا بھی انبیاء کی تبلیغ اسلام کا اتباع ہے ـــــ نبیوں نے درباروں میں تبلیغ تو ضرور کی مگر وہ نعوذ باللہ درباروں کے چوبدار نہیں اور دربان اور جاروب کش کبھی نہیں بنے۔ وہ بت خانوں میں بت توڑنے تو ضرور تشریف لے جاتے تھے۔ مگر بتوں کو مورچھل کرنے اور ان پر پہرہ دینے کبھی نہیں گئے۔ عکاظ کے بازار نبی عربی نے عرب کی جاہلی تہذیب کے شاہکاروں سے لوگوں کو نفرت تو ضرور دلائی، مگر اس کے ننگے ناچوں سے لطف اندوز ہونے کی کوئی خواہش حضور کے سینے میں نہ تھی۔ آپ نے فحش مشاعروں کے ٹکٹ نہیں بیچے۔ آپ نے جوئے اور پانسوں کے کھیلوں کی نظامت قبول نہیں کی ـــ ـــ مگر آپ اس طرح کے سارے مقاماتِ ذلّت پر کھڑے ہونے کیلئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ انبیاء بھی تو باطل کے اڈوں تک تبلیغ کے لئے گئے تھے!

آخر جو شخص سینما کے عریاں مناظر کی جھلکیاں خریدتا ہے اور کلب گھر میں بیسوں کے ناچ دیکھتا ہے۔ اور کوٹھوں پر گناہ کی راتیں بسر کرتا ہے۔ اور شراب خانے میں آتش سیال کے پیمانے چڑھاتا ہے وہ مبلغ اسلام کیونکر ہو جاتا ہے؟ ـــــ پھر نظام باطل کے اڈوں پر باطل کی خدمت اور اعانت کے لئے حاضری دینے والے حضرات اپنے کارناموں کو انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ سے کس طرح نسبت دیتے ہیں؟ کیا اسلام کی تبلیغ ترکِ اسلام اور قبول کفر سے ہوتی ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر آپ پیٹ کی خاطر کفر و باطل کی خدمت کرنا چاہتے

ہیں تو شوق سے کیجئے۔ مگر انبیاء کو بدنام کرنے کا آپ کو کیا حق ہے۔ کیا گناہ کرنے کے لئے بھی "واللہ امرنا بہا" کہنے کی ضرورت ہے؟

باطل کاریوں میں خلوصِ نیت

ایک خالص خادمِ اسلام ادارہ نے اپنے مسلک کے مختلف اجزا میں سے ایک یہ بھی گنایا ہے:۔

"خلوص نیت ہر کام محض اللہ کے لئے کرنا۔ میونسپل کمشنری۔ اسمبلی کی ممبری، شہرت یا دنیوی نام و نمود کے لئے نہ کرنا۔ حضورؐ نے نمود کے لئے کسی کام کے کرنے کو منع کیا ہے!"

کیا "خلوص نیت" غلط مشغلوں اور باطل کاریوں میں بھی مطلوب اسلام ہے؟ کیا کسی مہاجن کا کارندہ بننا۔ کسی شراب خانے میں منشی گری کرنا۔ انگریز کے ریوڑ کا گڈریا بن جانا، یہ ایسے کام ہیں کہ ان کو اگر خلوص نیت سے للہ فی اللہ کیا جائے اور نام و نمود اور شہرت طلبی اور خیانت وغیرہ سے اجتناب کیا جائے تو اس پر خدا تعالیٰ اپنے خزانۂ انعام کا منہ کھول دے گا کہ لو میرے مخلص بندو! مرتے اٹھاؤ، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ خدا کا کام کیا تھا!

ہماری دانست میں تو خلوص نیت اور اخلاق اسلامی کو باطل کاریوں میں استعمال کرنا ایسا ہی ہے جیسے بھنگ گھوٹنے کے لئے زمزم کا پانی استعمال کیا جائے۔ اور کون نہیں جانتا کہ یہ میونسپل کمشنریاں اور اسمبلی کی ممبریاں بغیر الیکشن

کافرانہ نظام کی کلیں ہیں۔ جن کا چلانا خود مہاپاپ ہے۔ اور خلوص نیت سے چلانا مہاپاپ کا بھی پاپ ہے!

مسلم شراب خانہ

دہلی سے ایک دوست لکھتے ہیں:-

کشمکش حصہ سوم میں سیدی المحترم مولانا مودودی صاحب نے تو یہی فرمایا تھا کہ اب صرف اتنی کسر باقی ہے۔ کہ "اسلامی شراب خانے"، "اسلامی قحبہ خانے" اور "اسلامی قمار خانے" جیسی اصطلاحات سے آپ کا تعارف شروع ہو جائے۔ لیکن ہمارے مقامی مسلمان اخبار ۔ ۔ ۔ میں جو ایک اشتہار نکلا ہے۔ اس نے یہ کسر بھی پوری کر دی۔ اشتہار کا کٹنگ خط کے ہمراہ منسلک ہے۔ آپ اشتہار کے تراشے کا مطالعہ کرنے کے لئے بیتاب ہوں گے۔ کیونکہ اس نے ہندوستان میں اسلامی ترقی کے تمام زینے طے کر لئے ہیں۔

ملاحظہ ہو:-

کرایہ کے لئے خالی ہے۔

پولیس لائنز دہلی میں ایک ہندو اور ایک مسلم شراب خانہ (ہ۔ [illegible]) کرایہ کے لئے خالی ہے۔ درخواست کے فارم عہ ادا کرنے پر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس دہلی کے دفتر سے مل سکتے ہیں۔ ٹنڈر ۶ اکتوبر ۱۹۶۳ء تک لیے جائیں گے

غالباً مدیر تیر و نشتر کو اس پھوڑے پر نشتر چلانے کی ضرورت نہیں جو ہندوستان میں مسلم قومیت کے جسد پر نکلا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی پھوڑا نہیں۔ بلکہ پورا جسم ایسے ہی بدبودار پھوڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ ریز رو بنک میں مسلم حقوق کی کتاب و سنت کی روشنی میں ایستن " ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا کی آیت لکھ کر ووٹ کو اپنی جماعت کے امیدوار کے حق میں ڈالنے کی ہدایت نظام باطل کی مشینری کو چلا کر نظام حق قائم کرنے کے ارادے۔ اپنے مرید کو سرکار انگریزی کی خدمت کے لئے گزیٹڈ افسر بنائے گئے لئے اللہ سے دعا۔ یہ سب موجودہ عہد کی اسلامی ذہنیت کے کرشمے ہیں اور کون ہے جو اعتراض کر سکے کہ مسلمان ہو کر شیطان کی پرستش کیا معنی رکھتی ہے۔ مسلمانوں کا مقابلہ ہمسایہ کافر قوموں سے ہے۔ اور ضروری ہے کہ وہ کفر کی وادیوں میں بھی ان سے بڑھ جائے۔

کمیونزم کی پناہ گاہ

کمیونسٹوں کو کانگرس اپنے صنم کدہ سے دھکیل دھکیل کر باہر نکال رہی ہے اور یہ لوگ سیدھے لیگ کے کیمپ کی طرف لپکے چلے آرہے ہیں۔ جہاں ہر درگاہ کے مردودوں کی قدر و قیمت بڑھ رہی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ وہ لوگ جو خدا اور رسول اور قرآن پر صدق دلی سے ایمان نہیں رکھتے۔ جو اسلام کے غلبہ کا راستہ روکنے کے لئے صف بستہ

ہیں، انہیں پناہ اگر مل رہی ہے تو کہاں، عین مسلم لیگ کے سایۂ شفقت میں کیونکہ مسلم لیگ کے اراکین قومی نسبت کے اعتبار سے اگر "مسلمان" ہیں لیکن جماعت کی ہیئت مسلمان نہیں ہے۔ یعنی اس کے دستور میں کوئی دفعہ ایسی موجود نہیں۔ جو منکر اسلام کمیونسٹوں کو حکومت الٰہیہ قائم کرنے والی مسلم لیگ میں داخل ہونے سے روک سکے۔ اس کا کوئی اعتقادی و عملی مطالبہ ایسا نہیں ہے جو کھوٹے مال کو چھانٹ سکے۔

افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی بصیرت بہت ضعیف واقع ہوئی ہے۔ انہیں اگر اپنی قوم پرستانہ سرگرمیوں میں کسی گروہ کی طرف سے وقتی مدد ملنے لگے تو وہ اس کے ہاتھ بک جاتے ہیں۔ حالانکہ بعض اوقات ایسی عیارانہ امداد کے پیچھے دشمنانِ ملت ایسے کاری وار کر جایا کرتے ہیں۔ کہ صدیوں زخم مندمل نہیں ہوتے۔ لیگ کی اوٹ میں کھڑے ہونے والے کمیونسٹ اسلام کے نام پر مسلمانوں میں نفوذ کریں گے اور پھر مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے اسلام کا گلا کٹوائیں گے۔ جب یہ ہو چکے گا تو خوشی منائیے گا کہ حکومت الٰہیہ قائم ہو گئی۔

تسخیرِ خودی

سر اسٹیفورڈ کرپس نے ایک تقریر میں فرمایا ہے کہ:۔
ہمیں نئی مشینوں یا نئے سیاسی نظریوں کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اعلیٰ اخلاقی

اصولوں کی ضرورت ہے۔ نسلِ آدم نے مادّیت کے میدان میں بےشمار دریافتیں کی ہیں۔ مگر انسان اپنی مادی قوتوں پر روحانی یا اخلاقی گرفت رکھنے سے قاصر ہے۔"

نبی اس مقصد کے لئے مبعوث کئے گئے تھے۔ کہ وہ عقل کی فراہم کی ہوئی مادی قوتوں پر انسان کا اخلاقی تفوق قائم کریں۔ آسمانی کتابوں کا نزول اسی لئے ہوا تھا۔ کہ دورِ تسخیرِ فطرت کرتے کرتے انسان "آدم شکار" نہ بن جائے۔ مگر تم ظالم انسانوں نے انبیاء اور ان کی کتب کو جھٹلایا۔ ان کا مذاق اڑایا۔ انہیں دورِ وحشت کے لئے مخصوص قرار دیا۔ اور اپنی بیگانہ عقل پر زندگی کی ساری فلاح و بہبود کا انحصار رکھا۔ تم نے یہ سمجھا کہ تمہاری دانش جو ہوا اور پانی کو رام کر سکتی ہے۔ وہ نفس کے شیطان کو بھی رام کر سکے گی۔ تم نے ضد کی کہ ہم جو آسمانوں پر اڑنے کا راز ڈھونڈ سکتے ہیں۔ امن و مسرت کو فروغ دینے والے کھوج بھی لگا لیں گے ——— مگر ہوا کیا! یہ کہ تسخیرِ فطرت کی رفتار حد درجہ تیز ہو گئی۔ لیکن تسخیرِ خودی کی مہم آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹی سے

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

چنانچہ آج ہر قدم جو مادی ترقی کی راہ پر اٹھتا ہے۔ تباہی کی طرف اٹھتا ہے کیونکہ اخلاقی انضباط کے بغیر قوائے فطرت کا استعمال کبھی حق اور عدل کے لئے نہیں ہو سکتا۔

دنیا کی یہی ضرورت جس کی طرف کرلیس اشارہ فرماتے ہیں پورا کرنے کے

لئے ہم اور ہمارے رفقا میدان عمل نہیں آ رہے ہیں۔

غیرتِ اسلامی

پنجاب اسمبلی کے اراکین طاغوتی نظام سے حلف وفاداری لے رہے تھے کہ بیگم شاہنواز کی باری آگئی، آپ نے حلف لیا اور اس کے بعد حسب رواج ہاتھ اسپیکر سے مصافحہ کے لئے بڑھا دیا مگر مسٹر سنگھا دیر تک متامل رہے کیونکہ باجی رشیدہ لطیف صاحبہ پچھلی مرتبہ ایک اور روایت قائم فرما چکی تھیں۔ یعنی ہاتھ مصافحہ کے لئے سپیکر نے بڑھایا تھا۔ اور آپ نے اسلام کی خاطر اسے بے نیل مرام لوٹا دیا تھا۔

اس پر ایک معاصر مسلم لیگ کی طرف روئے سخن کر کے لکھتا ہے کہ دیکھا ہماری باجی رشیدہ لطیف کا کارنامہ کیسا "اسلامی" تھا، اور ادھر ایک تمہاری بیگم شاہنواز ہیں کہ گورنر سے ہاتھ ملاتی پھرتی ہے۔

مگر معاصر یہ بات بھول گیا کہ باجی رشیدہ ہوں یا بیگم شاہنواز اسمبلی ہاؤس میں وہ اسلامی روایات کا مظاہرہ کرنے نہیں جاتیں ——— بلکہ مسلم قوم کے حقوق محفوظ کرانے جاتی ہیں، اور اس کام میں غیر مرد سے مصافحہ کرنا مضر نہیں بلکہ مفید رہتا ہے ——— بعض مسلمانوں کی غیرت اسلامی بھی عجیب ہے کہ سموچا اسلام پامال کیا جا رہا ہو تو انہیں پروا نہیں ہوتی مگر اس کے کسی ایک جزء پر پاؤں پڑتا دیکھ کر وہ گھبرا جاتے ہیں کہ ہائے یہ کیا ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید مسلمانی نام ہے اوّلیاتِ اسلام کو اس انداز سے ذبح کرنے کا کہ چند سطحی اسلامی روایات کا اس میں مظاہرہ ہوتا رہے بنیادی عقاید کی فکر نہیں، اہم ترین اصولوں کی پروا نہیں، فرائض و واجبات کی یاد نہیں ——— اور بس کھٹکا ہے تو اس کا کہ غیر مسلموں کے سامنے ذرا "اسلامیت" کا کوئی نمائشی اعلان کرنے میں کوتاہی نہ رہ جائے۔
ایک نظام کفر کا جزو بن جانا کوئی تشویش کا باعث نہیں ——— مگر ایک غیر مسلم مرد سے ہاتھ ملانے میں تقویٰ کی توند پچک جائے گی، غیر مسلم کے دل سے دل اور دماغ سے دماغ مل گئے تو غم نہ تھا، مگر غیر مسلم کے ہاتھ سے ایک عورت کا ہاتھ چھو گیا تو قیامت آگئی ——— اور اگر نہ چھوا گیا تو جہاد فی سبیل اللہ ہو گیا!"

خدا اس جدید مسلمانی سے مسلمانوں کو بچائے۔!

طاغوت کے ساتھ خدا کا حصہ

اور ادھر مسلم لیگ کے ایم۔ ایل۔ اے حضرات نے فلسفۂ اسلامیات میں معاصر کے بھی کان کاٹ ڈالے ہیں! ——— وہ اسمبلی کی تقسیم اوقات میں نماز کا مسئلہ لے دھمکے، اور "طاغوت" ان کے جو اوقاتِ عزیز لینا چاہتا تھا ان میں سے انہوں نے اپنے اللہ میاں کا حصہ بھی لگوانا چاہا تاکہ وہ بھی خوش ہو جائے اور اسمبلی کے ہنگامۂ دنیا پرستی میں "اسلامی حقوق" بھی محفوظ رہیں

اگر کسی رقص گھر یا میخانے میں کچھ لوگ مجلس رقص اور مجلس مے کو نماز کے لئے ملتوی کرانا چاہیں تو دنیا کا ہر بدھو بھی ایک زور کا قہقہہ لگا دے گا، مگر اسمبلی میں یہی "جمع اضداد" ہوتا ہے تو بڑے سے بڑا عقلمند سنجیدگی سے اس کی داد دیتا ہے ــــــ یہ منظر بھی کتنا لطیف ہے کہ جب ۱۲ بجے سے ۲ ½ بجے تک "طاغوت" کی پوجا ہو چکی ہے تو مولانا داؤد غزنوی سے لیکر میاں افتخار الدین تک خدا کی عبادت کے لئے صف بصف کھڑے ہو جاتے ہیں ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

اور پھر ایک گھنٹے کے بعد "طاغوت" کی عبادت شروع ہو جاتی ہے۔ اسلام کے مکمل تصور حیات ہونے کے ساتھ زندگی کی یہ تقسیم کتنی اچھوتی تقسیم اور کتنا باکمال کارنامہ ہے۔

کفر میں مفادِ اسلام

ہندوستان کے ایک دینی ادارہ کی سرگرمیوں کا ایک وقتی مقصد یہ بنایا گیا ہے کہ

"مجالس مقننہ کے ذریعہ دینی مسائل میں جو تحریف کی جاتی ہے اس کا انسداد کیا جائے ...."

مگر سوال یہ ہے کہ ایک لادینی ادارے کے اندر دینی مسائل کو تحریف سے بچانے یا دین کے مفاد کو محفوظ کرانے کا مطلب کیا ہے؟ آخر کیا آپ

آپ لوگ اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ ایک بت خانے کے منتظمین کی کمیٹی میں کچھ علماء کو شریک کرائیں کہ وہ وہاں مفاد اسلامی کو محفوظ کرائیں؟ —————
یا کیا آپ ایک شراب خانے کے مالکوں میں خود کو محض اس بنا پر شامل کر سکیں گے کہ آپ وہاں کے حسابات میں بد دیانتی کی روک تھام کرائیں گے جو ایک غیر اسلامی طریق معاملہ ہے ؟

حضرات! کسی "حرام ادارہ" کے اندر "مفاد اسلام" کا "محل وقوع" ہرگز نہیں ہے۔ حرام اداروں کو تو بالکلیہ ختم کرنے میں مفاد اسلام ہے۔

موجودہ اسمبلیوں میں شرکت کے معنی یہ ہیں کہ شرکاء نے اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ خدا بندوں کا حاکم نہیں ہے، بلکہ انسان حاکم ہے اور کتاب و سنت قانون کا سرچشمہ نہیں ہیں، بلکہ جمہور کی خواہشات ہیں ————— تو پھر "ایمان باللہ" کو اتنا بڑا ضرر پہنچانے کے بعد اگر کسی زیر ترتیب قانون میں کوئی پسندیدہ تبدیلی آپ نے کرا بھی لی تو معاملہ نفع کا نہ ہوا خسارہ کا ہوا۔

خدا کے لئے سوچئے کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں!

یوم النبیؐ

دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی سال بھر تک اپنے ہادی و رسول حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی یاد سے غافل رہنے کے بعد ایک روز تذکار نبوی کا ہنگامہ بپا کرنے کی رسم میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

قطع نظر اس کے کہ یوم میلاد النبی کی تقریب سے قرن اول بالکل بیخبر رہا ہے اور اس کی ایجاد کا فخر ان جہلا کو حاصل ہے۔ جو تعلیمات اسلام سے بے خبر اور اسرار سنت سے ناواقف ہیں جس طریق سے ہندوستان میں یوم النبیؐ منایا جاتا ہے۔ وہ بھی ایسا ہے کہ اگر حضرت عمرؓ مسلمانوں کو اس موقعے پر دیکھ پائیں تو ان کو پکڑ پکڑ کر درے لگائیں اور ٹکٹکی سے باندھ کر تازیانے کی سزا دیں۔ اور ثواب پانا تو درکنار ان کو جان بچانا مشکل ہو جائے۔

اس سلسلے میں ایک مولوی صاحب بنگلور سے ایک اپیل ارسال فرماتے ہیں جس میں وہ مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"برادران اسلام! اسلام کی مقبولیت کی راہ میں صرف ایک حقیقی مشکل آج یہ ہے کہ آج تک ہندو اچھوت اور انگریز وغیرہ دین اسلام کی لذت سے واقف نہیں ہیں۔ اگر ان کو تمام عمر میں بھی ایک بار حضور انور شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنا دیا جائے تو کامل یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ہڈیوں اور خون میں یہ پیغام نبویؐ جذب ہو کر رہ جائے گا۔

پیغام نبوی کی بلاشبہ یہی تاثیر ہے۔ لیکن اس وقت حقیقی مشکل یہ نہیں کہ غیر مسلموں نے پیغام نبوی نہیں سنا بلکہ حقیقی مشکل یہ ہے۔ کہ خود مسلمانوں نے پیغام نبویؐ سن کر قبول نہیں کیا۔ انہوں نے جلسے کرنا جلوس نکالنا۔ کمیٹیاں بنانا چندہ جمع کرنا۔ تقریریں کرانا اور ہنگامہ آرائی کے تماشے منعقد کرنا تو سیکھ لیا ہے۔ مگر پیغام نبویؐ کی لذت سے روح کو بہرہ اندوز نہیں کیا۔ جب تک اسلام کا

پیغام پہنچانے والے خود اسلام کی لذت سے واقف نہ ہوں گے۔ اس وقت تک غیر مسلموں کی ہڈیوں اور خون سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔ کامیاب مبلّغ وہ ہے۔ جو پیغام کو پہلے خود جذب کرے۔

قوم کا نکاح

آج کل مسلمانوں میں وحدت و تنظیم اور امارت و قیادت کے مسائل زور شور سے چل رہے ہیں۔ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا لیڈر کون ہو۔ اس سوال کو حل کرنے کے لئے ان امور پر قطعاً غور نہیں کیا جاتا کہ یہ لیڈر کس قوم کے لئے مطلوب ہے۔ کس منزل مقصود کا سفر درپیش ہے۔ اس کے لئے کس نوعیت کا آدمی موزون اور مناسب ہے۔ جو قوم سفر پر نکل رہی ہے اس کے مقتضیات کیا ہیں۔ بلکہ صرف یہ سوچا جا رہا ہے کہ لیڈر مقرر کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں جب انتخاب کا موقع آتا ہے۔ تو جو شخص سامنے آتا ہے اس کو لیڈر بنا لیا جاتا ہے اگر کوئی کہے کہ یہ آدمی تو موزون نہیں تو جواب ملتا ہے اور پوری سنجیدگی کے ساتھ کہ حسن و قبح پر بحث مت کرو۔ اگر اچھا لیڈر نہیں ملتا۔ تو برے ہی پر قناعت کر لو۔ قوم کی اصل ضرورت لیڈر کا تقرر ہے۔ لہذا اچھے اور برے کی تمیز بیکار ہے۔ جو مل جائے اسی کے ہاتھ میں اپنی زندگی کی باگ ڈور سونپ دو۔

گویا قوم ایک لڑکی ہے جو سن بلوغ کو پہنچ چکی ہے۔ اس کا نکاح اب ضرور کر دینا چاہیئے۔ اگر کوئی بھلا آدمی نہیں ملتا۔ تو جیسا مل جائے! اس کے پلّے باندھ

دو۔ کسی زمانے میں جہلا ایسا بھی کر لیا کرتے تھے۔ مگر اب تو جہلا بھی نہیں کرتے تاہم ہندوستان کی مسلمان قوم لیڈری کے متعلق اسی اصول کی قائل ہے۔

کام کا آدمی

معلوم نہیں جب غالب مرحوم نے یہ شعر کہا تھا کہ ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

تو "کام" سے ان کی مراد کیا تھی، مگر موجودہ دور میں کام کا آدمی کیا ہوتا ہے اس سوال کا جواب ذیل کے واقعے سے لگائیے:۔

ایک مسلمان نوجوان جو عہد حاضر کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے مودودی صاحب کی مشہور کتاب خطبات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے والد کے ایک دوست نے اسے اس "خطرناک" حالت میں دیکھ پایا۔ اور اس کے والد سے جا کر نہایت دلسوزی کے ساتھ کہا کہ آج کل برخوردار مودودی صاحب کی کتابیں پڑھ رہا ہے۔ ان کے مطالعے میں تو کوئی حرج نہیں، لیکن ذرا اس کا خیال رکھنا چاہیے ورنہ یہ "کسی کام کا نہیں رہے گا"۔

"کسی کام کا نہیں رہے گا" اس فقرے کا کیا مطلب ہے۔ کیا وہ پاگل ہو جائیگا؟ ہوش و حواس کھو بیٹھے گا؟ بداخلاق ہو جائے گا؟ سینما دیکھنے اور قوالی یا مجرا سننے کی عادت پڑ جائے گی؟ شرابی یا قمار باز ہو جائے گا؟ بے دین اور ملحد ہو جائے گا؟ ——— نہیں ان میں سے کوئی بات نہیں ہو گی۔

بلکہ اس کے دل میں دین کو جملہ ادیان باطل پر غالب کرنے کی لگن لگ جائے گی۔ وہ اپنی پوری زندگی اسلام کی اطاعت میں دے دیگا۔ اللہ کے قانون کے سوا ہر قانون کی اطاعت کا منکر ہو جائے گا۔ اسلامی نظام حیات کے علاوہ ہر نظام زندگی کی خدمت سے دستکش ہو جائے گا۔ اور اسی لئے پی۔ سی۔ ایس آئی۔ سی۔ ایس اکونٹنسی اور اسی قسم کے امتحانات مقابلہ سے بیزار ہو جائے گا۔ اور چونکہ نظام باطل کی خدمت کے کام کا نہیں رہے گا۔ اس لئے کسی کام کا نہیں رہے گا۔ لیکن اگر اس نے دین کی کتابیں نہ پڑھیں یا ان کا کوئی اثر قبول نہ کیا تو وہ طاغوتی نظام حیات کا ایک کارآمد پرزہ بن سکے گا اور بڑے کام کا ہوگا۔ یہ ہے مفہوم آج کل "کام" کا جس کے لئے مسلمان کو پیدا کیا گیا ہے!

اسلامی کلچر

اسلامی کلچر کیا ہے؟ اس کا فیصلہ آج تک نہیں ہو سکا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال تھا۔ کہ لوٹا اور پاجامہ اسلامی کلچر ہے۔ مگر مسٹر جناح نہ لوٹا استعمال کرتے ہیں اور نہ پاجامہ پہنتے ہیں۔ اس لئے پنڈت نہرو کا نظریہ غلط ثابت ہوا۔ اور چونکہ کسی شخص نے اس جملے کی تشریح نہیں کی تھی۔ لہذا اب تک فیصلہ یہی تھا کہ اسلامی کلچر وہ ہے جس کو ہندوؤں سے خطرہ ہے اور جس کی حفاظت کے لئے پاکستان قائم کرنا چاہیئے۔

لیکن دہلی کے ایک مسلمان اخبار نویس نے سفر بمبئی کے دوران میں اس

اشکال کا حل معلوم کر لیا۔

مشہور فلمی مؤرخ سہراب مودی کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ "پکار" کی مشہور فلم انہی کی فن کاری کی رہین منت ہے۔ [illegible] مدت کے آتش پرست ہیں۔ ان سے ملاقات کرنے کے بعد ہمارے مسلمان اخبار نویس رقمطراز ہیں:۔

"میری بمبئی میں ان سے دوسری ملاقات ہے۔ انشاء اللہ اور خدا کا فضل جیسے الفاظ کا بار بار ان کی زبان سے ادا ہونا بتا رہا ہے کہ مودی صاحب پر اسلامی کلچر کا کتنا گہرا اثر ہے۔ وہ اسلام کی غیبی نصرت فرمائیوں اور اسکی لامحدود طاقت کے آج کل کے بہت سے نام نہاد مسلمانوں سے زیادہ قائل ہیں۔ یہی وجہ ان کی قابل رشک کامیابی کی ہے۔

تو اسلامی کلچر اس کا نام ہوا کہ آدمی کی زبان سے "خدا کا فضل" اور "انشاء اللہ" کے الفاظ بار بار ادا ہوں۔ اور وہ خدا کی تصرف فرمائیوں اور لامحدود طاقت کا قائل ہو۔ مثلاً جب وہ گفتگو کرے تو اس طرح بولے میں نے جب "پکار" کی فلم بنائی تو مجھے اندیشہ تھا کہ خدا جانے کامیاب ہوگی یا نہیں لیکن خدا کی غیبی نصرت و امداد کے قربان جایئے کہ وہ اتنی مقبول ہوئی کہ خدا کے فضل سے برسوں چلتی رہی۔ آج کل میں ایک اور مغل اسٹوڈیو کی بات چیت کر رہا ہوں۔ اور خدا کی لامحدود طاقت کے بھروسہ پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ انشاء اللہ پکار سے بھی زیادہ کامیاب ہوگی ——— اسی طرح ایک وکیل مقدمات کی کثرت کے لئے، ایک رشوت خور افسر رشوت کے متعلق۔ ایک سرکاری ملازم اپنی ترقی کے

بارے میں، ایک بنک کا منیجر سودی کاروبار کی ترقی کے سلسلے میں اس "اسلامی کلچر" کا استعمال کر سکتا ہے۔

حکومت الٰہی

ایک دوست نہایت دلچسپ گذارش کرنے کی جرأت فرماتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں:۔

آپ حکومت الٰہی کہاں قائم کریں گے۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ پہلے ایک حصہ زمین پر اقتدار قائم کرلیں۔ جہاں ہمیں قومی نشوونما کے لئے پوری آزادی ہو اور پھر آگے قدم بڑھائیں۔ جیسا کہ خود خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ آپ نے مدینہ کو مرکز قرار دے کر نظام اسلام آہستہ آہستہ پھیلا دیا۔

گذارش ہے کہ ہم حکومت الٰہی اس حصہ زمین پر قائم کریں گے جس میں اقتدار قائم کرنے کے لئے آپ جدوجہد کر رہے ہیں۔ جب آپ کو ہندوؤں اور انگریزوں کی مہربانی سے زیر سایۂ باطل کوئی حصہ زمین حاصل ہوجائے گا، تو آپ یہ دیکھ کر حیران ہوجائیں گے کہ حکومت الٰہی قائم کرنے کے لئے آپ کے پاس رعایا ہی نہیں اور جو لوگ موجود ہیں وہ خدا کی حکومت نہیں بلکہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس خطرے کا ازالہ کرنے کے لئے ہم حکومت الٰہی کی رعایا تیار کر رہے ہیں۔ تاکہ جب حصۂ زمین نمودار ہو۔ تو رعایا ناپید نہ ہوجائے۔

لیکن تفنن برطرف حکومت الٰہی کے قیام کے لئے زمین کی ضرورت نہیں

ہے۔ زمین تو پہلے سے موجود ہے۔ جو چیز نہیں ہے وہ رعایا ہے۔ اس لئے حکومت الٰہی کے قیام کے لئے زمین کی تلاش غلط ہے۔ ضرورت رعایا تیار کرنے کی ہے حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریق کار بتایا ہے۔ یثرب موجود تھا اوس و خزرج موجود تھے۔ عرب موجود تھا۔ مگر حکومت الٰہی کی رعایا مفقود تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں وہ بندگان حق تیار کئے جنہوں نے یثرب میں جاتے ہی نظام حق کی صورت اختیار کرلی۔ ورنہ اگر محض حکومت منظور ہوتی تو قریش مکہ تو ابتداء سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا بادشاہ بنانے کے لئے تیار تھے۔ لیکن آپؐ حکومت الٰہی کی عمارت کن اینٹوں سے چنتے کیا ابوجہل اور ابولہب اور عتبہ بن ربیعہ وغیرہ سے۔

مروان اور مسلمان

خاندان بنو امیہ کے مشہور خلیفہ عبدالملک کا یہ قول مشہور ہے۔ کہ جب تخت خلافت اس کے نصیب میں آیا تو اس نے قرآن مجید کو مخاطب کرکے کہا ھذا فراق بینی و بینک "اب میری راہ اور ہے اور تیری راہ اور۔" مؤرخ اسی قول کو عبدالملک کے معائب اور مثالب میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ قول اس غریب کے محاسن اور فضائل میں شمار ہونا چاہیئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا دینی ذوق اس حقیقت سے واقف تھا۔ کہ ملوکیت و شاہی اور قرآن دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

یہ ممکن نہیں کہ آدمی بادشاہ بھی ہو اور پھر قرآن بھی اس کا ساتھ دے۔

حقیقت میں عبدالملک جیسا آدمی بھی ان ارباب صلاح و تقویٰ سے ہزار درجہ بہتر ہے جو نظام باطل کے ساتھ اپنی زندگی کو ساز گار کئے ہوئے ہیں۔ اور ان کا ذوق اسلامی ایک لمحہ کے لئے تکدر اور کبیدگی محسوس نہیں کرتا وہ قرآن مجید کی تلاوت ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔ اس کی تبلیغ و اشاعت اور اس کے اسرار و معارف پر کتابیں لکھتے ہیں۔ اور مطمئن ہیں کہ تمسک بالقرآن کے تقاضوں کی تکمیل فرما رہے ہیں۔ مگر ان کی زندگی کا ہر لمحہ غیر قرآنی نظام حیات کے قیام کے لئے وقف ہے۔ عبدالملک برا تھا کیونکہ اس نے قرآن سے جدائی اختیار کر لی۔ لیکن وہ لوگ اس سے بھی برے ہیں۔ جو قرآن سے ربط قائم کیے ہوئے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید ان سے دامن چھڑا لینا چاہتا ہے۔ حق کو حق سمجھنا اور پھر اس پر عمل نہ کر سکنا برا ہے۔ اور باطل ہی کو حق سمجھنا اور پھر مطمئن ہو کر ہم حق پر عمل کر رہے ہیں بہت ہی برا ہے۔

اسلام برحق ہے ——— مگر!

خواجہ غلام صمد رکن پنجاب اسمبلی نے ایک بل پیش کیا تھا جس کا نام تحریک مسلم مساوات بل رکھا تھا۔ اور اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں میں ذات، پات پیشے اور مذہب کی وجہ سے جو تفریق و امتیاز سرکاری طور پر قائم کر دیا گیا ہے اس کو دور کر دیا جائے۔ اور ہر مسلمان کو خواہ وہ کسی ذات اور قبیلے اور پیشے

سے تعلق رکھتا ہو۔ معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے یکساں حقوق حاصل ہوں۔

اس پر ایک مسلمان معاصر رقمطراز ہے:۔

خواجہ غلام صمد کے یہ ارشادات قابل احترام ہیں کہ اسلام نے آقا و غلام سرمایہ دار مزدور اور بادشاہ و گدائے گوشہ نشیں کو ایک سطح پر لاکر کھڑا کیا ہے۔ مساوات اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ اس کی نگاہ میں زنگی و فرنگی ایک ہیں۔ خاندانی و نسلی تفوق کوئی چیز نہیں ۔ ..... لیکن اگر مساوات بل قانونی صورت اختیار کر لیتا۔ تو قانون انتقال اراضی افسانۂ پارینہ بن کر رہ جاتا۔ یعنی اسلام اور اس کی تعلیمات اپنی جگہ برحق ہیں۔ مگر قانون انتقال اراضی ان سے بھی محبوب تر اور فائق تر ہے۔ خدا اور رسول نے جو کچھ فرمایا۔ اس کی صحت میں کلام نہیں۔ مگر زمین کے ٹکڑے اور پیٹ کے ٹھیکرے ان سے زیادہ اہم ہیں ——— قانون اسلام افسانۂ پارینہ بن جائے تو مضائقہ نہیں قانون انتقال اراضی کو داستان حال ہی رہنا چاہیئے۔

فضل رب

میکلوڈ روڈ لاہور پر ایک عالیشان مکان میں اشتراکی جماعت کا صوبائی دفتر ہے۔ اور اس کی بلندیوں پر فضا میں کمیونسٹ پارٹی کا جھنڈا لہراتا رہتا ہے۔ اشتراکیت انکار خدا کے اصول پر قائم ہے۔ مگر جس مکان میں صوبائی اشتراکی پارٹی کا دفتر ہے۔ اور جس میں سے انکار خدا اور الحاد کا تعفن گرد و

بیش میں پھیلتا ہے۔ اس کی پیشانی پر جلی حروف میں لکھا ہے

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ

یعنی "یہ سب میرے رب کا فضل ہے"

آج عالم اسلام کی پوری زندگی اس دکان اور اس کے اندر رہنے والوں کی نوعیت رکھتی ہے۔ جہاں تک اس کی "پیشانی" کا تعلق ہے۔ اس پر لکھا ہے۔ "لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" مگر جہاں تک ان کے سروں پر بلند ہونے والے جھنڈوں اور ان کی عملی زندگی اور کردار کا تعلق ہے۔ وہ کلمہ اسلام کے دونوں اجزاء کے انکار پر مشتمل ہیں۔ کہیں یہ بات اقتصادی ضرورتوں کے ماتحت ہو رہی ہے۔ کہیں سیاسی اقتدار کے نام سے، کہیں قومی احیاء و ترقی کے مقصد سے اور کہیں "کلمہ حکمت" کے فریب کا نام سے۔

"دکان"

مسٹر جناح نے احمد آباد میں لا کالج کے طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے وکالت کے پیشے کو معزز پیشہ قرار دیا۔ اور تلقین کی کہ اس پیشے کی عزت، صداقت اور روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کرو۔ مسٹر جناح نے کہا "یاد رکھو وکالت پنساری کی دکان نہیں ہے۔ یہ ایک بڑا معزز پیشہ ہے"

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ مسٹر جناح کا اشارہ کس وکالت کی طرف ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں جس پیشے کو وکالت کہتے ہیں۔ وہ اسلام کے نقطہ نظر سے قانون

باطل کی پیروکاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور عملی نقطۂ نگاہ سے جتنی بے ایمانی جھوٹ اور فریب کاری اس پیشے کے ذریعے ہوتی ہے۔ اتنی کسی اور تمدن اور مہذب طبقے کے ذریعے نہیں ہوتی ہوگی۔

مسٹر جناح نے پنساری کی دکان پر وکالت کو ترجیح دی۔ حالانکہ پنساری اگر چاہے تو صحیح معنی میں رزق حلال کھا سکتا ہے۔ مگر ایک وکیل اگر چاہے بھی تو ایک دانہ رزق حلال کا اس کے حلق میں اتر کر نہیں جا سکتا۔ وکالت بلا شبہ پنساری کی دکان نہیں۔ وہ طوائف کی دکان ہے۔ جو اصولاً اور عملاً فسق اور بدکاری ہے۔ بلکہ شاید طوائف اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے۔ اور وکیل کا ظاہر و باطن مختلف۔

سودا

ایک فلم بنانے والے نے اگلے روز اعلان کیا کہ وہ ایک نئے زنانہ چہرے کے لئے جو اس کی نئی فلم میں کام کرنے کے لئے آمادہ ہو پچاس ہزار روپیہ دینے کے لئے تیار ہے۔ ایک فلمی تصویر ۴۰ روز میں تیار ہو جاتی ہے۔ جن میں سے ایک اداکار کو بمشکل ۲۵ روز کام کرنا پڑتا ہے۔ اس حساب سے ایک اداکار عورت روزانہ دو ہزار روپے کما لیتی ہے۔ یہ آمدنی پنجاب کے ایک وزیر کی روزانہ آمدنی سے ۲۰ گنا زائد ہے۔ وزیر اعظم کی آمدنی سے ۱۵ گنا۔ گورنر کی آمدنی سے ۷ گنا۔ اور وائسرائے ہند گورنر جنرل بالقابہ کی آمدنی

سے ۳ گنا۔

حساب و شمار کی اس توضیح کے بعد ایک شخص ملک کی حسین نوجوان عورتوں کو رغبت دلاتا ہے کہ وہ اس پیش کش پر غور فرمائیں۔ آمدنی کے متعلق اعداد و شمار اور تنا سب بلاشبہ آرزو انگیز ہیں۔ مگر شخص مذکور نے اس "آمدنی" کے مقابلے میں، اُس "خرچ" اور اس "قیمت" کے بدلے میں، اس "جنس" اور اس "رقم" کے بدلے میں اُس "موتی" کا اندازہ نہیں لگایا۔ جو ایک اداکار حسینہ کو پیش کرنا پڑتا ہے —— وہ ہے اس کی عصمت، اس کی عفت، اس کی عزت، اس کی آبرو۔ جس کا بدلہ پچاس ہزار تو کیا، پچاس کروڑ اور پچاس ارب روپیہ بھی نہیں ہو سکتا۔ فلم کی صنعت میں کام کرنے والیاں اگر اپنی عصمت کے موتی کے بدلے میں چند ہزار روپے روزانہ نہیں چند لاکھ بھی لے لیں۔ تو عورت کے نقطۂ نگاہ سے یہ خسارے کا سودا ہے۔ اگر رغبت دلانے والا شخص اس تجارت کے دوسرے پہلو کا ذکر بھی کر دیتا تو بہتر ہوتا۔

دین حق اور دین باطل

انگلستان کے نائب وزیر ہند کی زوجہ محترمہ نے حال ہی میں لندن کی ایک عدالت کے سامنے اپنے معزز خاوند کے خلاف عرضی گزرانی کہ حضرت والا زانی ہیں۔ اور ان کی زناکاری کے شغل مسلسل پر نہ صرف ان کی بیوی گواہ

گواہ ہے۔ بلکہ ایک ہوٹل کے ملازمین بھی - بارہ برس کی ازدواجی زندگی میں نائب وزیر ہند صاحب جو ایک ممتاز انگریز خاندان کے چشم و چراغ ہیں اپنی آشنا ؤں کے ساتھ مصروف اختلاط رہتے رہے ہیں - اور منع کرنے پر بھی باز نہیں آئے۔ اس دعویٰ کی تائید اس ہوٹل کی ایک ملازمہ اور ملازم نے بھی کی - اور بتایا کہ صاحب موصوف جوان دنوں چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت کرنے والی وزارت میں نیابت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ہوٹل میں تشریف لاتے رہے ہیں۔ اور زناکاری فرماتے رہے ہیں۔

عدالت نے الزام کو درست پایا۔ کیونکہ مدعا علیہ صاحب اس الزام کی تردید کرنے کے لئے حاضر عدالت ہی نہیں ہوئے۔ اور طلاق وار د کر دی؛

اس واقعے سے اہل یورپ کی اخلاقی حیثیت واضح ہوتی ہے لیکن اس سے زیادہ اس کے قوانین معاشرت کی خوبی، جن میں طلاق کے لئے خاوند یا بیوی کو بھری عدالت میں زناکار ثابت کرنا ضروری ہے۔ اس کے خلاف اسلام کا قانون معاشرت بھی طلاق کا ضابطہ پیش کرتا ہے۔ مگر اس طرح کہ علیحدگی کے بعد نہ خاوند عدالت مجاز کا مصدقہ زناکار ہوتا ہے اور نہ بیوی مستند بدکار۔ ——— یہ اصولی فرق ہے جو خدا کے نازل کئے ہوئے دین اور بندوں کے بنائے دین میں صرف ایک ضابطہ ظاہر کرتا ہے۔ اور تعجب ہی ان لوگوں کی عقل پر جو اس کے باوجود گمان کرتے ہیں کہ خدا کے دین کے باہر بھی کلمۂ حکمت ہو سکتا ہے۔

معبود کا احترام

وسطی لندن کے ایک قہوہ خانہ کے ایک ملازم کو کسی شخص نے مشورہ دیا کہ تم آگ بجھانے کے محکمہ کے ملازم ہو جاؤ۔ اس نے جواب دیا "نہیں یہ کام میرے مذہب کے خلاف ہے۔" شخص مذکور نے پوچھا "ارے تم کیا بلا ہو؟" جواب ملا "میں پارسی ہوں۔" میں آگ کو پوجتا ہوں۔ میں اس کو بجھا نہیں سکتا۔" اللہ اکبر! معبود باطل کے پرستار کی صحت فکر اور استقامت عمل!

اس کا عقیدہ مشرکانہ اور غلط سہی۔ مگر اس کا طرز عمل کتنا منطقی ہے۔ آگ کو پوجنا اور پھر اس کو بجھانا؟ —— یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ لیکن ان مدعیان توحید کی بدذوقی کا ماتم کرو۔ جو خدا پرستی کے مدعی ہیں۔ دین حق کے پیرو ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر زندگی کے ہر عمل میں خدا کی نافرمانی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ دعویٰ اسلام کی حفاظت و خدمت کا، مگر چند ٹکوں کی خاطر وہ اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اور نہیں شرماتے۔ خوب کہا ہے غالب نے ؎

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شیطان کی اجازت سے

ایک مسلمان معاصر رقمطراز ہے کہ اس کی تحریک احیائے اسلامی سے والیان

ریاست بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ اور اس میں حصہ لینے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ مگر وہ پوچھتے ہیں کہ اس پر کہیں حکومت کو تو اعتراض نہیں ہو گا۔ معاصر اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے۔ کہ اس عقدے کو والیان ریاست ہی حل کر سکتے ہیں۔
لیکن یہ ایسا عقدہ ہے جس کو مسلمان والیان ریاست حل نہیں کر سکینگے
.... دنیا میں اسلام پر اسی اصول کے ماتحت عمل ہو رہا ہے۔ کہ کفر کو اعتراض نہ ہو۔ خدا کی عبادت بھی اسی احتیاط کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ کہ شیطان اس کی اجازت دے۔ تعلیمات اسلامی کی پیروی اس قرارداد کے مطابق ہو رہی ہے۔ کہ ان کے کتنے حصے پر نظام باطل عمل کرنے کی اجازت دیتا ہے خدا کے احکام کی اطاعت میں اس امر کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کہ ہمارا نفس، ہمارے رسم و رواج، ہماری قوم، ہماری اقتصادی مصلحتیں، ہماری سیاسی ضرورتیں، ہماری جماعتی عصبیتیں کس حد تک ان کو گوارا کرتی ہیں۔
والیان ریاست نے تو ایمانداری کے ساتھ اپنے دل کی بات کہہ دی مگر عام مسلمان فریب نفس میں اس طرح مبتلا ہیں کہ وہ اپنی اسلامی زندگی کے اس شتر گربہ پن کو محسوس بھی نہیں کرتے۔ پابند صوم و صلوٰۃ وکیل۔ دیندار انسپکٹر آبکاری۔ متدین تھانیدار۔ انجمن اسلامیہ کے شراب خوار سیکرٹری۔ قومی خدمت کے فاسق علمبردار۔ تہجد گذار مجسٹریٹ اور نظام باطل کے خدا پرست حصہ دار۔ اس اطمینان کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں۔ گویا اپنی اسلامی زندگی کا حق ادا کر چکے ہیں۔

اُستادِ مغرب کے شاگرد

"اس بات کو پوری قوت کے ساتھ تسلیم کر لینا چاہئے کہ جہاں اسلام نے خالق اور مخلوق کے رشتے کو جوڑ کر دین اور دنیا کی تفریق مٹا دی ہے۔ وہاں اس نے اخلاق و معاشرت، تمدن و سیاست کا ایک مکمل دستور العمل بھی عطا فرمایا ہے۔ بلکہ صحیح معنی میں وہ فی نفسہ ایک مکمل تہذیب اور صالح تمدن ہے پس کسی مسلمان کو اصول و عقائد میں، نظام تمدن و اخلاق میں یورپ سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ البتہ ہمیں اپنے ایک بھولے ہوئے سبق کے لئے مغرب کو استاد ضرور بنانا ہو گا۔ یعنی مسلمانوں میں جس چیز کی کمی ہے وہ علوم تجربی اور صنعتی عملیات کی تحلیل ہے۔ اور اسی کمی کے باعث عالم اسلامی افلاس و نکبت غلامی اور فلاکت میں مبتلا ہے۔ اور اسی خامی کی بدولت لندن اور ماسکو کی طرف نظریں اٹھانے والے حیران ہیں کہ کیا کریں۔"

ان الفاظ میں ایک معاصر "دیروحرم" کا نظارہ دکھا کر "مغرب زدوں کے لئے راہ عمل" تجویز کرتا ہے ـــــ اب اس بات سے قطع نظر کہ محض اس بات کو پوری قوت سے تسلیم کر لینا قطعاً سودمند نہیں ہو سکتا کہ اسلام نے دین اور دنیا کی تفریق مٹا دی اور زندگی کا مکمل دستور العمل عطا فرمایا ہے۔ بلکہ اس دستور العمل پر عملی طور پر عمل کرنا ضروری ہے۔ معاصر کا اکتشاف بھی "علوم تجربی" اور صنعتی عملیات کی ایک لاجواب "تحلیل" کا کرشمہ ہے۔

کہ جو مسلمان لندن اور ماسکو کی طرف نظریں اٹھائے ہوئے ہیں۔ وہ اگر "علوم تجربی" اور صنعتی عملیات کی تحلیل میں لندن اور ماسکو کو استاد بنا لیں گے۔ تو عالم اسلامی کی نکبت اور فلاکت دور ہو جائیگی۔ دوسرے لفظوں میں قرن اولیٰ میں جب امیین عرب مکہ و مدینہ کی وادیوں سے نکل کر چار دانگ عالم پر چھا گئے تھے تو صرف اس لئے کہ انہوں نے علوم تجربی اور صنعتی عملیات کی تحلیل میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ ہم علوم و فنون کی اہمیت کا انکار نہیں کرتے۔ ہمیں انکار ہے تو اس سے کہ مسلمانوں کی فلاکت اور ان کے ادبار کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مجوزہ لیے ہوئے سبق کے لئے مغرب کو استاد نہیں بنایا۔ بلکہ عالم اسلام کے نکبت و ادبار کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے خدا کے دیئے ہوئے سبق کو بھلا دیا ہے۔ اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو پیروی حق میں اپنا استاد نہیں بنایا۔

ہمارے رہنما

مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کی طرف سے نئی دہلی کی ان مسجدوں کی تعمیر و حفاظت کے متعلق تجویز پیش ہوئی جن کے دروازے نمازیوں پر اس لئے بند ہو گئے ہیں۔ کہ خداوندان برطانیہ کے حق تعمیر و تاسیس کے مطابق وہ صاحب لوگوں کی کوٹھیوں اور بنگلوں کے اندر آ گئی ہیں۔

اس تحریک کی مخالفت میں جن لوگوں نے حصہ لیا۔ ان میں سر سلطان احمد سر فیروز خاں نون۔ سر محمد عثمان جیسے آنریبل بھی تھے۔ جو السرائے کی

اگزکٹو کونسل میں مسلمانان ہند کی نمائندگی کے لئے چار چار ہزار روپیہ تنخواہ لیا کرتے تھے۔

اس پر بعض مسلمانوں کو سخت تاؤ آیا ہے۔ ایک اخبار نویس یہ راز منکشف کرتا ہے کہ یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ ان لوگوں کو اسلام اسلامی مفاد، اسلامی قانون اور ملت اسلامیہ سے دور کا واسطہ نہیں۔ اور یہ لوگ ملت اسلامیہ کی خدمت کے لئے نہیں اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے مسلمانوں کے رہنما اور نمائندے بنے ہوئے ہیں۔

لیکن ہمیں ان مسلمانوں پر حیرت ہے جو ان آنریبل مسلمانوں کے طرز عمل پر حیرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ آخر ان لوگوں نے کب اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ اسلام، اسلامی مفاد، اسلامی قانون اور ملت اسلامیہ کے لئے سر کبف ہو کر وائسرائے کی کونسل میں جا رہے ہیں ——— نظام باطل کی خدمت کا فیصلہ اور پھر اسلام اور اسلامی مفاد کا خیال ؟ اور پھر ان کو مسلمانوں کے رہنما اور نمائندے کی حیثیت میں اگزکٹو کونسلر بنایا ہی کب گیا ہے۔ وہ اس لئے اس منصب پر مامور ہیں کہ انگریزی حکومت کی خدمت کریں۔ وہ حکومت کے بالکل اسی طرح کے نوکر ہیں جس طرح آپ کے اور ہمارے نوکر ہوتے ہیں۔ قصور حقیقت میں ان کا نہیں۔ قصور مسلمانوں کا ہے جو باطل کے غلاموں کو حق کا رہنما تصور کرتے ہیں۔

. . . .

علمائے کرام کا مصرف

لاہور کے دو مسلمان روزانہ اخباروں میں اس مسئلے پر بحث ہوتی رہی۔ کہ حضرات علمائے کرام کو مسلم لیگ میں شامل ہو جانا چاہیئے یا نہیں۔ دونوں اخبار مسلم لیگ کے حامی ہیں۔ مگر ایک تو شامل ہونے کا مشورہ دیتا ہے اور دوسرا عذر پیش کرتا ہے کہ جس جماعت میں فادیانیوں اور کمیونسٹوں کو شامل ہونے کا فخر حاصل ہو۔ اس میں حضرات علمائے اسلام کس طرح شامل ہو سکتے ہیں۔

حقیقت میں یہ ساری بحث علمائے اسلام کے مقام و منصب کو نہ سمجھنے کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ پھر علمار کے منصب و مقام کو سمجھنے میں دقت اس لیے پیش آئی ہے کہ حضرات علمار نے بھی اپنے مقام و منصب کو سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ عامۃ الناس کی طرح وہ بھی غیر اسلامی نصب العینوں کے حصول میں مصروف ہو گئے ہیں۔ لہذا ہر جماعت یہ سمجھنے لگی ہے کہ ان کا کام اور مصرف دوسروں ہی کی خدمت اور اقتدار ہے۔ قیادت کی باگ جہلار کے ہاتھ ہو۔ اور گاڑی علمار چلائیں۔ اگر آج علمائے اسلام خالص اسلامی نصب العین اور اسلامی طریق کار کے مطابق کام کرنا شروع کر دیں۔ تو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں ان سے مایوس ہو جائیں۔ لیکن غیر اسلامی قیادت کی یہی مایوسی حقیقت میں علمائے کرام کا صحیح مصرف معین کرے گی۔

تعلیم حاضر

شمالی پنجاب کے ایک قصبے کے متعلق ایک دوست نے ایک نہایت دلچسپ واقعہ لکھ بھیجا ہے۔ اس قصبے میں ایک ہائی اسکول قائم ہے۔ پہلے یہ مڈل اسکول تھا۔ مگر علاقے کے باشندوں نے جب اپنی جانیں برطانوی سلطنت کے استحکام کے لئے بیدریغ لڑا دیں تو خادمان سلطنت یعنی حکام نے اپنے اثر و رسوخ سے کافی چندہ جمع کیا اور مڈل کو ہائی بنا دیا۔

اسکول کو ترقی دینے کے لئے دو دفعہ طوائف کو بلوا کر محفل رقص و سرود بھی برپا کی گئی۔ اور اس کے اہتمام کا سر رشتہ جناب تحصیلدار کے ہاتھ میں تھا۔ تحصیل وصول کے لئے ان سے کون اہل تر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ آج اس قصبے میں جو ہائی اسکول قائم ہے اس کی عمارت میں رنڈیوں کے ناچ سے حاصل شدہ کمائی کی اینٹیں بھی شامل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس عمارت میں بیٹھ کر جو نسل تعلیم حاضر حاصل کر کے نکلے گی وہ فنون لطیفہ کی ماہر و کامل کیوں نہ ہو گی۔ رقص و سرود تو گویا اس کی گھٹی میں پڑے ہوں گے۔ سچ کہا اقبالؒ نے ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے　　شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

سر وفی بدا خلت

ملک خضر حیات نے پنجاب اسمبلی میں سینہ تان کر ارشاد کیا تھا۔ کہ ہم

پنجاب کے معاملات میں بیرونی مداخلت کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ فقرہ ملک خضر حیات کا نہیں بلکہ سر سکندر مرحوم کا ہے۔ کہ جب تک وہ زندہ رہے مسٹر جناح کو انہوں نے پنجاب کے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہ دی اس پر ایک ہندو معاصر ان سے پوچھتا ہے کہ جناح صاحب تو بیرونی آدمی سہی۔ مگر سر برٹرینڈ گلینسی گورنر پنجاب بالقابہ پنجاب کے کونسے ضلعے اور شہر کے رہنے والے ہیں۔ سوال ضرور بے ڈھب ہے۔ مگر ملک صاحب کہہ سکتے ہیں۔ کہ گورنر صاحب تو آقا ہیں۔ غلام کا جو کچھ ہے آقا کا ہے۔ پنجاب کیا پورا ہندوستان گلینسی صاحب کا ہے۔ اور گلینسی صاحب پر کیا موقوف ہر گورا مالک رقاب ہے۔ اور جہاں چاہے مداخلت کر سکتا ہے۔ مداخلت تو ایک غلام کی دوسرے غلام کے معاملے میں ناجائز ہے۔

لیکن لطف برطرف جو لوگ بیرونی مداخلت کو پنجاب کی حدود میں گوارا کرنے کیلئے تیار نہیں کبھی انہوں نے سوچا کہ ان کی پوری زندگی مداخلت کو گوارا کر رہی ہے۔ انسانی زندگی کا یہ "پنجاب" خدا کے بنائے ہوئے نظام حیات کا پابند بنایا گیا تھا۔ مگر انسان اس میں شیطان کے بنائے ہوئے ضابطوں کو نافذ کرتا ہے اور کبھی محسوس نہیں کرتا کہ یہ بیرونی مداخلت کیسی۔

اتحاد پارٹی ہو یا مسلم لیگ، کانگرس یا لبرل لیگ۔ سب اپنے اپنے دائرے میں بیرونی مداخلت کو گوارا نہیں کرتے۔ مگر یہ کیا قیامت ہے کہ معمولی قسم کی مداخلتیں تو انہیں ناگوار ہیں مگر سب سے بڑی مداخلت گوارا ہی نہیں پسندِ خاطر

بھی ہے۔ بلکہ مطلوب و مقصود بھی!

"رُول دی گل"

ایک دوست کا بیان ہے کہ ریل گاڑی کے سفر میں ایک مسلمان سرکاری ملازم کو دیکھا جو ایک وکیل سے مصروف گفتگو تھے۔ اور پوچھ رہے تھے کہ وہ اپنے سفر خرچ کا بل ایسے طریقے سے بنانا چاہتے ہیں کہ خاصی رقم سرکار سے وصول کر سکیں۔ اس پر وکیل صاحب نے جو ابھی ابھی ارشاد فرما چکے تھے۔ کہ ہم تو فساد چاہتے ہیں۔ اور لوگوں کے پاس روپیہ افراط سے ہوگا۔ اور مقدمہ بازی کریں گے تو ہمارے پاس آئینگے۔ جواب دیا کہ مصنوعی اور وضعی بل بنانا تو ایمانداری کے خلاف ہے۔

سرکاری ملازم نے ایمانداری کے اس وعظ پر پنجابی زبان میں فرمایا۔ کہ "ایمانداری دی گل چھڈو۔ رُول دی گل کرو"۔ یعنی دیانت کے بکھیڑے کو الگ رکھو یہ بتاؤ کہ ضابطہ اور قاعدہ کیا کہتا ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے تصور کے بغیر زندگی کا نظام صحیح طور پر بنایا جا سکتا ہے۔ وہ انسانی فطرت کے اس معمولی سے کرشمے کو ملاحظہ فرمائیں اچھا خاصا مرد معقول جب دیکھتا ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے ضابطے کی پیروی سے جتنے پیسے زائد مل سکتے ہیں تو وہ فوراً ایمانداری کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے ——— حقیقت میں زندگی کا نظام اسی وقت

صحیح طور پر کام کر سکتا ہے کہ "رَدل دی گل" اور ایمانداری دونوں پہلو بہ پہلو ہیں یعنی ضابطہ بھی خدائی ہو اور جوابدہی بھی خدا کے سامنے ہو۔

"یورپ کا دردِ سر"

ایک برطانوی اخبار رقمطراز ہے کہ جنگِ عالمگیر کے نتائج میں سے ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ "غیر منکوحہ ماؤں" میں بے حد و شمار اضافہ ہو گیا ہے۔ نہ صرف یورپ میں بلکہ برطانیہ میں بھی غیر منکوحہ مائیں ایک اہم سوال بن گئی ہیں۔ یہی حال امریکہ اور کناڈا میں ہے۔

یہ نیا "دردِ سر" جو یورپ کو "نازیت" کا بخار اتر جانے کے بعد لاحق ہوا ہے۔ ایک لاعلاج مرض ہے۔ اور ابھی کیا ہے۔ یہ تو ابتدائے عشق ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

انسان یہ سمجھتا ہے کہ اپنی زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں وہ خدا کی امداد کے بغیر کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ ایک مصیبت کو دور نہیں کر چکتا کہ دوسری عظیم تر مصیبت اس پر نازل ہو جاتی ہے۔ انسانی تاریخ ابنِ آدم کی اس غلط جدوجہد میں گذری ہے۔ مگر تعجب ہے کہ اب تک اس کو عبرت نہیں ہوتی۔

ایک طرف اس نظامِ حق کو دیکھئے۔ جو خدا کے دین کے مطابق عرب میں قائم ہوا تھا۔ اس نے فرد اور اجتماع دونوں کے مسائل کو حل کیا۔ اس

نے معاشرت اور اقتصاد کو صحیح بنیادوں پر قائم کیا۔ اس نے سیاست اور اخلاق کا ایک پاکیزہ نظام بنا کر دکھا دیا۔ یہاں تک کہ ہر گھر تقویٰ و طہارت اور امن اور سکون کا آماجگاہ بن گیا۔ دوسری طرف یورپ کے مہذب انسانوں کو دیکھئے کہ ہر نئی جدوجہد میں وہ نئی الجھنیں پیدا کر دیتا ہے۔

توحید و رسالت کا راز

ایک شیخ طریقت نے منبر پر چڑھ کر فرمایا کہ جو لوگ مسلم لیگ میں شامل نہیں ہیں۔ ان کو ہندو ناموں سے پکارنا چاہیئے اس پر معاصر انقلاب جو مسلم لیگی پاکستانی اور قائداعظم کا پیرو ہونے کا مدعی ہے۔ گھبرا کر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو تنابزوا بالالقاب سے منع فرمایا ہے اور مشائخ شغل تکفیر سے اجتناب کرنے میں مشہور ہیں۔ مگر یہ ان شیخ طریقت کو کیا ہو گیا کہ وہ خدا کے حکم کی بھی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور مشائخ کے طریقے سے بھی خلاف جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ مسلم لیگ نہ خدا ہے نہ رسول کہ اس کے انکار سے کوئی شخص کافر ہو جائے۔

لیکن معاصر اس حقیقت کو فراموش کر رہا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے اصل منصب اور مقام کو بھول جاتی ہے اور اپنے حقیقی نصب العین کی بجائے غیر حقیقی نصب العین اختیار کر لیتی ہے۔ تو پھر اس کے لئے ہر شے خدا اور رسول بن جاتی ہے۔ توحید و رسالت کا یہی تو راز ہے۔ ایک مرتبہ خدا و رسول سے جو

آدمی بہک جائے پیر ہر آستانہ اس کے لئے خدا ہے اور ہر مدعی اس کے لئے پیغمبر، اور ان سے انکار کرنے والا کافر ——— باقی رہا "تنابز بالالقاب" تو مسلمان علماء اور مشائخ جن مشاغل میں آج مصروف ہیں۔ ان کے سامنے تنابز بالالقاب تو ایسا ہے جیسے ہاتھی کے آگے مچھر۔

زندہ باد!

کشمیر میں کانگرسی لیڈروں کے حق میں اور ان کے خلاف جو "جائز" اور "ناجائز" مظاہرے ہوئے ہیں ذرا سوچئے ان میں کیا کیا ہو سکتا ہے؟ ——— ہم ہی عرض کر دیں۔ جھنڈیاں، جھنڈے، سیٹیاں، باجے، ماٹو اور قطعات وغیرہ ——— یہی ہندوستانی سیاست کے بڑے بڑے اسلحہ ہیں۔ اور انہیں سے حکومت برطانیہ کا قلع قمع کیا جائیگا۔ مگر جناب اس۔ دی ساز و سامان میں جان ڈالنے کے لئے ایک روحانی چیز بھی استعمال ہوتی ہے۔ نعرہ! یہ یاد رکھئے کہ نعرہ ایک "مدہ وجود" شمار ہوتا ہے یقین نہ آئے تو اس کا تجزیہ کر دیکھئے کہ یہ ایک سر اور ایک دھڑ رکھتا ہے اور جماعتیں اسی "سر دھڑ کی بازی" لگایا کرتی ہیں۔

ان کے سر کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ جن کی بنا پر ان کا شخصی نام یا نوع معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دھڑ ہر سر کے ساتھ ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ یعنی "زندہ باد" ——— لیکن اس کے ساتھ "مردہ باد" کے حالات بھی آپ نے اخبارات

ہیں پڑھے ہوں گے۔ یہ در اصل کوئی بڑا فرق نہیں، صرف جنسی تقسیم ہے ——!
خیر تو اب زندہ باد کا دھڑ لیجئے اور اس پر "پاکستان" کا سر لگا دیجئے تو یہ لیگی نعرہ بن جائے گا۔ اور اگر سر ہو "راشٹر پتی" تو نعرہ صاحب کانگریسی ہو جائینگے۔
موجدین خاص خاص موقعوں میں نعروں کے نئے نئے ڈیزائن پیش کرتے رہتے ہیں تاکہ ان کی مانگ قائم رہے، چنانچہ ہنگامہ کشمیر میں ایک نئے نعرہ صاحب لوگوں کے مشاہدے میں آئے جبکہ کوئی پکارا ——
"شہنشاہ پاکستان زندہ باد"
مگر اس نعرے کو قانونی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جہاں شہنشاہ ہو وہاں پاکستان کا قیام ممکن نہیں اور جہاں پاکستان ہو وہاں شہنشاہ کا وجود نہیں ہو سکتا —— مگر پھر بھی ہم موجد صاحب کی خدمت میں عرض کرینگے "زندہ باد"

جذبۂ زندگی بخش

ایک جرمن عورت جو وطن سے باہر مقیم ہے۔ یہ دردناک اطلاع سن چکی ہے کہ جرمنی کے ہاتھ سے تلوار لے لی گئی اور اس کی ساری سیاسی تنظیم کو توڑ پھوڑ ڈالا گیا ہے اور اس کے جملہ معاشی وسائل پر اغیار کا قبضہ ہے اور اسے از سر نو زندگی دے سکنے والے لیڈروں کو موت کے اژدہا کے حوالے کیا جا رہا ہے —— اُف یہ اندوہ کی تاریکی جس میں امید

کا کوئی جگنو چمکتا نظر نہیں آتا! .... مگر وہ عورت اس تاریکی میں خود ایک مجسمۂ امید ہے۔ اور وہ اپنے جذبات نہفتہ کا اظہار یوں کرتی ہے کہ جرمنی ختم کر دیا گیا مگر وہ پھر زندہ ہوگا۔ اور از سر نو وہ برطانیہ سے لڑے گا۔ میں اپنا بچہ پالوں گی۔ صرف اس لئے کہ وہ جوان ہو کر جرمنی کے دشمنوں سے لڑے۔ ایسے ہی جذبات قوموں کو زندہ رکھتے ہیں۔

یہ جذبہ کسی اصول حق کے محور پر نہیں گھوم رہا۔ بلکہ وطنی عصبیت اس کی محرک ہے، پھر بھی اس میں کتنی زندگی ہے!

آہ! کیا مسلمان قوم کے اندر بھی کوئی ایسی ماں ہوگی جو اپنا بچہ صرف اس لئے پال رہی ہو کہ وہ جوان ہو کر اسلام کے دشمنوں کے خلاف لڑے گا؟ اور اسلام کا اقتدار از سر نو قائم کرنے کے لئے جد و جہد کرے گا! .... ہے کہیں یہ جذبۂ زندگی بخش؟

اشتراکی مسلمان

ایک ادبی پرچہ میں یہ دردناک سطور نظر سے گزریں جن میں مدیر سے خطاب کیا گیا ہے۔ پڑھیئے اور عبرت حاصل کیجئے۔

"آپ نئی جنریشن کے اشتراکی رجحانات پر حیران ہوتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ یہ وقت کے پیچ و تاب ہیں۔ جو الجھتے جاتے ہیں لیکن سلجھتے نہیں۔ کوئی ساڑھے چار برس ہوئے۔ کالج کے دنوں میں ہم لوگ بہت شور مچاتے

تھے۔ نیلا گنبد (لاہور) کے پاس نور محل ہوٹل میں یا اس کے عقب میں نگینہ ٹی شاپ کے اندر یا وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے برآمدوں میں اشتراکی ماڈل کی خفیہ مجالس ہوتی تھیں۔ ایسی کارروائیوں میں ہم چار دوست بہت پیش پیش تھے۔ لیکن جو انجام ہمارا ہوا وہ خدا نہ کرے کسی اشتراکی کا بھی ہو —— دو نے کلرکی اختیار کر کے شادی کر لی۔ تاکہ اگر پدر نتواند پسر ... تیسرا فوج میں کمیشن لے بیٹھا۔ اب بال روم میں شراب پیتا اور ناچتا ہے میری سیادت کا نمونہ یہ ہے کہ ہر مہینے ڈیڑھ دو درجن کلرکوں کی تھوڑی سی تنخواہ ہڑپ کر لیتا ہوں۔ اور اس پر بھی سول لسٹ سامنے رکھ کر سوچتا ہوں کہ سینئر گریڈ آنے میں کتنے برس باقی ہیں —— خود فریبی کا ایک ڈھنگ یہ ہے کہ الحمد للہ میں مسلمان ہوں"

یہ ہندوستان کے اشتراکی مسلمان کی تصویر ہے۔ اس کو اپنے ادبی البم میں احتیاط سے لگا کر رکھئے۔ ممکن ہے کل کو یہ مخلوق اس ہیئت کذائی کے ساتھ ختم ہو جائے۔ اور "الحمد للہ کہ میں مسلمان ہوں" کی دم بھی غائب ہو جائے۔

ابلیس جوان ہو رہا ہے ساقی

ابلیس عمر کے اعتبار سے بہت بوڑھا ہو رہا ہے۔ اور لاکھوں کروڑوں بہاریں اور خزائیں اس پر بیت چکی ہیں۔ مگر اس کی ہمت آج بھی اتنی ہی

جوان ہے یہ جنتی خدا کے روبرو اعلان بغاوت کرتے وقت تھی۔ قال

رب بما اغویتنی لازینن لھم فی الارض ولاغوینھم اجمعین۔

کہ اے رب تو نے مجھے گمراہی پر مجبور کر دیا ہے۔ تو اب دیکھ کہ میں تیرے بندوں کو سبز باغ دکھا دکھا کر کیسے گمراہ کرتا ہوں۔ یہ دھن کا پکا اور اپنی ہٹ پر قائم ہے۔ تخلیق البشر کا بیڑا اٹھانے کے بعد اس نے اپنے فرض میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اسے نبیوں کی دعوتیں شکست نہ دے سکیں۔ اسے حکومت الٰہیہ کا قیام اور حق و باطل کا غلبہ ہرا نہ سکا —— مگر خدا کے بندوں کو دیکھئے کہ وہ باطل کی عارضی چمک دمک سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور کفر کے وقتی غلبہ سے ہمت ہار دیتے ہیں۔ یہ جوانی میں بوڑھے ہیں اور ابلیس بڑھاپے میں جوان۔ چنانچہ اس نے تازہ جنگ عالمگیر کا جو ایٹم بم انسانیت پر پھینکا ہے۔ اس کی تباہ کاریاں دیکھ کر جناب ماہر القادری پکار اٹھے ہیں کہ ؎

ابلیس جوان ہو رہا ہے ساقی

قرآن اور اسلامی سیاست

س — "آپ اور یہ منصب؟ —— جب کہ آپ کو قرآن سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے!"

ج: — "جی یہ بجا ہے، مگر بندہ تو صرف مسلمانوں کا سیاسی لیڈر ہے پیغمبر قرآن ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا!"

یہ سوال و جواب اگر حقیقت ہوں تو پھر "آپ مسلمانوں کے سیاسی لیڈر" کی ذہنیت کا کیا تصور قائم کریں گے؟ یعنی قرآن سے اگر واسطہ ہو سکتا ہے تو صرف مفسرین قرآن کو ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ مسجدوں میں بیٹھ کر اس کا درس دیتے رہیں اور اس کے مطالب پر مقالات لکھتے رہیں۔ قرآن کا مطالبہ صرف اتنا ہی ہے کہ اس کی تفسیریں لکھی اور بیان کی جاتی رہیں۔ باقی رہے دنیا کے عمل کے مسائل، سوال میں مسلمان جو چاہیں کریں ——— آخر قرآن کو "مسلمانوں کے سیاسی لیڈر" سے کیا مطلب؟ ——— مسلمانوں کی اسلامی سیاست تو ہمارے سیاسی لیڈر صاحب کے طفیل قرآن کی بندشوں سے رہائی پا چکی ہے۔ ورنہ اگر سیاست میں قرآن کو کوئی دخل ہوتا تو مسلمان مجبور ہوتے کہ قرآن کے کسی عالم کا دامن تھامیں۔

اگر اس طرح کے کوئی لیڈر آگے چل کر "اسلامی ریاست" کے صدر ہو جائیں اور اس وقت ان سے سوال کیا جائے کہ صاحب آپ "خلافت" سنبھالے ہوئے ہیں مگر قرآن تو آپ کو آتا نہیں ——— تو وہ منہ توڑ جواب دیں گے کہ جناب یہ خاکسار "خلیفۃ اللہ" ہے نہ کہ مفسر قرآن!

مگر اب کیا ہو سکتا ہے!

۲ ستمبر کو شہنشاہ جاپان اتحادی فتح کی خبر دیوتاؤں کو اپنی زبان سے سنانے کے لئے تین شاہی مندروں میں تشریف لے گئے۔ اور انہیں بتا آئے کہ تین ہزار

سال کی سلطنت کا خاتمہ ہو چکا۔

جاپان پر یہ لمحہ کتنا بھاری ہو گا۔ یہ خبر کتنی تلخیوں کے ساتھ سنی گئی ہو گی۔ اپنے فوری زوال کے منظر پر لوگ کس طرح آنسو بہاتے ہوں گے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے!

اسی دردناک لمحے سے دنیا کی جماعتوں اور قوموں اور حکومتوں کو بچانے کے لئے فطرت کے پروردگار نے فطری اخلاقی قوانین دے کر انبیاء کو بھیجا کہ وہ عروج و زوال اور قوت و ضعف کے اٹل دستور سے لوگوں کو آگاہ کر دیں۔ مگر سرکشوں نے ان قوانین کو تسلیم کرنے سے ہر دور میں انکار کیا اور نتیجۃً انجام سے دوچار ہوئے۔

جرمنی اور جاپان کے اس انجام پر ان کے فاتحین کو مسرت اندوز ہونے کی جگہ عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی فطرت کے تقاضوں سے انحراف کر رہے ہیں۔ اور ان کا انجام بھی وہی ہونے والا ہے ـــــ آج ایک کی باری ہے، کل دوسرے کی، پرسوں تیسرے کی!! پھر اس وقت تم بھی یہ کہو گے "مگر اب کیا ہو سکتا ہے!"

خدا کی بادشاہت

ایک صاحب اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں کہ ہماری جماعت کا مقصد خدا کی زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا ہے ـــــ بجا ارشاد ہوا۔ بڑا

نیک ارادہ اور بڑا پاک مقصد ہے۔ مگر یہ تو ارشاد ہو کر اس کی تدبیر کیا ہے؟ شیطان کی بادشاہت میں عہدے اور مناصب حاصل کرنے کی دوڑ میں حصہ لینا طاغوت کی حکومت کے قیام میں جان و مال صرف کرنا ——— اگر یہی تدبیر ہے تو خود ابلیس نے بھی کیا خدا کی بادشاہت سے انکار کیا ہے، اس کا قصور بھی تو صرف یہ ہے کہ حکومت الٰہی کو تسلیم کرنے کا جو تقاضا تھا اس کو پورا نہیں کیا تھا ——— اللہ اکبر۔ خدا کی بادشاہت کے قیام کے ارادے بذریعہ خدمت شیطان و بادشاہت شیطان!

بے اسلام مسلمانی

مسلمانوں کی بہت بڑی نمایندہ سیاسی جماعت کے سامنے ایک قرارداد اس مضمون کی آنے والی ہے کہ "جملہ ارکان مجالس عاملہ کے لئے نماز باجماعت لازمی کر دی جائے۔ تجویز کے مبارک ہونے میں کسے کلام ہے۔ ذرا سے جو مسلمان پڑھے سنے گا وہ مسلمان جو کیا ہوگا۔ اگر مسرت کے جوش سے جامے سے باہر نہ ہو جائے۔

لیکن اس تجویز میں جو بات لطیفے کی ہے اسے جوش مسرت میں بھولنا نہیں چاہئے۔ خدا نے تو ہر مسلمان کے لئے نماز کو فرض قرار دیا تھا۔ مگر یہ مسلمان جماعت صرف ممبران مجالس عاملہ پر اسے فرض قرار دے رہی ہے۔ گویا خدا کے ضابطہ میں اسے ترمیم کا حق بھی حاصل ہے۔

پھر طرفہ ماجرا یہ کہ انجمن بازی سے لوگوں کو نمازی بنانے کا تجربہ ہونے لگا ہے۔ جیسے "دورِ خلافت" سے لیکر آج تک بارہا آزمایا جا چکا ہے اور ناکام رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے کام عوام میں ہوتا تھا۔ اور اس وجہ سے چار دن چل جاتا تھا۔ مگر اب ہونے لگا ہے "بڑوں" میں۔ اس وجہ سے ہم یقین دلاتے ہیں کہ نتیجے کی "بلی" کوشش کے "تھیلے" سے ہرگز باہر نہ آئے گی!

مگر سب سے لطیف پہلو تو ابھی سامنے لایا ہی نہیں گیا۔ ذرا سوچئے کہ مسلمان جماعتوں کے "بڑوں" کا بھی کیا حال ہے کہ "مسلمان" پہلے ہیں۔ اور نمازی بعد میں بنیں گے۔ اگر زیادہ کریدیں تو معلوم ہوگا کہ بالعموم لوگ مسلمان تو ہیں مگر نہ ابھی نہ توحید پر ایمان ہے، نہ رسالت کا کما حقہٗ احترام ہے۔ نہ قیامت پر یقین ہے نہ مقصدِ حیات "اسلامی" ہے نہ طریقِ کار قرآنی! یہ ہے نئے اسلام مسلمانی"۔

خودکشی کی طرف!

ایٹم بم کی ایجاد پر آج دنیا بھر میں لکھا اور بولا جا رہا ہے۔ مگر شاید ڈیلی ٹیلیگراف کے اس جملے کے بعد کچھ اور لکھنے اور کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ:-

"نوعِ انسانی پر انتہائی عظیم ذمہ داری آپڑی ہے!

مگر آہ! اس عظیم ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے جن عظیم اوصاف کی ضرورت ہے وہ موجودہ دور کا انسان اپنے اندر پیدا نہیں کر سکا ہے۔ اس کی مادی

طاقتیں ہیبت ناک اور تباہ کن ہوتی جا رہی ہیں۔ مگر ان طاقتوں کو مفادِ انسانی کا خادم بنانے کے لئے جو اخلاقی اصول درکار ہیں۔ وہ کہیں بھی برسرِ عمل نہیں ہیں۔ پھر انسان کی دسترس میں کائنات پر جتنی جتنی بڑھ رہی ہے۔ اس میں سیاسی نخوت اور معاشی جباریت کا بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس "نشۂ کبریائی" کو جو "ترشی" اتار سکتی ہے۔ اس سے پوری دنیا کو چڑ ہے یعنی خدا پرستی سے!

پھر جب انسان کو انسان بنانے والے عوامل ناپید ہیں اور کرۂ ارضی محض دو ٹنگے جانوروں کا گلہ ہے۔ تو اس طویلے میں کسی اسلحہ کا پہنچ جانا اور اس کے استعمال پر ان جانوروں کا قادر ہو جانا خود انہیں کی تباہی کا سامان ہو گا۔

قدرت بھی انسان کو اس کے جرائم کی سزا دینے کے لئے کس غیر محسوس طریقے سے "خودکشی" کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ فطرت سے تباہ کن آلات مانگتا ہے۔ اور فطرت بھی اس کے مطالبے پر ایک سے ایک بڑھا چڑھا کر "سامانِ موت" اور "سامانِ قیامت" فراہم کر رہی ہے۔ پھر یہ سامان انسان کے ہاتھوں خود ہی انسان پر استعمال ہوتے ہیں ؎

تا بہ بیرو آں سراپا اہرمن   ہمچو حیوانات ایامِ کہن

پروردگار کا حق

کریمیا کانفرنس کے فیصلوں کی تشریح کرتے ہوئے مسٹر روز ویلٹ صدر امریکہ نے ایک دلچسپ اصول بیان کیا۔ انہوں نے کہا "نقشہ کا مرتب کرنے

سے صحرائی علاقوں کی آبادی، مکانوں کی تعمیر اور وادیوں کی اصلاح و ترقی کے متعلق نہایت مفید نتائج نکلا کرتے ہیں۔ اس لئے جنگ کے بعد دنیا کو جن خطوط اور راہوں پر چلانا ہے۔ ان کا نقشہ ہم نے آج ہی مرتب کر لیا ہے۔"

مسٹر روزویلٹ نے یہ کہہ کر اپنی دانست میں عقل و دانش کا بہت بڑا تیر مارا تھا۔ حالانکہ ابتداء سے متکبرین ارضی اسی غلطی میں مبتلا رہے ہیں۔ یہ لوگ انسانوں اور صحرا اور وادی میں امتیاز نہیں کرتے۔ اور سمجھتے ہیں کہ محض قوت و زر سے ہم انسانوں کی قسمتوں کو بھی اسی طرح اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیں گے۔ جس طرح مٹی، پتھر اور پانی کو۔ حالانکہ مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اور وہ ان کو اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق نظم و ترتیب دے سکتے ہیں۔ مگر انسان کو پروردگار عالم نے اپنی بندگی کے حلقے میں رکھا ہے۔ اور اس کی زندگی کا نظام خود مرتب کیا ہے۔

روزویلٹ، چرچل اور اسٹالین اپنے پیشرو متکبرین فی الارض کی طرح انسانوں کا نقشہ زندگی بنانا چاہتے ہیں۔ یہ گویا بندے کا خدا بننے کی کوشش کرنا ہے اور ناممکن ہے کہ اس کوشش کا نتیجہ ان کوششوں سے مختلف ہو جو خدا کے پہلے باغی کر چکے ہیں ——— ہلاکت، تباہی، بربادی، پشیمانی۔"

حق و باطل

صاحب کے ملک کے کسی مقام کی اطلاع ہے کہ وہاں کی کوئی دس نو عمر

صاحبزادیاں جن کی عمریں ۱۵-۱۶ سال سے زیادہ نہیں ہیں۔ ایک روز جمع ہو کر ایک فوجی نظربندیوں کے کیمپ پر حملہ آور ہو گئیں۔ اس کیمپ میں امریکن سپاہی نظر بند تھے۔ اور یہ لعبتان فرنگ ان کے دام محبت میں اسیر تھیں۔ ان دو سو نوجوان لڑکیوں کو غصہ تھا کہ ان کے محبوب سپاہیوں کو نظر بند کیوں کیا گیا ہے

یورپ کی تہذیب اور سیاست کا اصول یہ ہے۔ کہ پہلے تہذیب بے حیائی اور آوارگی پیدا کرتی اور سیاست اس کو ترقی کی علامت قرار دیتی ہے۔ مگر جب بے حیائی اور آوارگی بڑھ کر سیاست کے حدود کو پھاندنے لگتی ہے۔ تو وہ ڈنڈا، لاٹھی، سنگین، بندوق، مشین گن اور مارشل لا لے کر مقابلہ پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

یہی صورت یہاں پیش آئی۔ جب تک یہ لڑکیاں غیر ملکی مردوں سے محبت کی پینگیں بڑھاتی رہیں، سیاست و تہذیب فرنگ خوش و مطمئن رہیں۔ مگر جب انہوں نے نظر بندی کے خلاف احتجاج کر دیا۔ تو سیاست بگڑ گئی۔ جب تک شرافت و اخلاق کے حدود پامال ہوتے رہے۔ کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ یہ سمجھا گیا کہ انگلستان کا حسن امریکہ کی جوانمردی کی قدر کر رہا ہے۔ مگر جب اس نے وارفتہ شوق ہو کر سیاست کے مقدس حدود بھی پھاندنے لئے تو لاٹھی اور طوق و زنجیر کا مظاہرہ ہونے لگا۔

دین حق اور دین باطل کا یہی بنیادی فرق ہے۔ دین حق گناہ کے تمام رخنے بند کرتا ہے۔ تقویٰ کی فضا پیدا کرتا ہے۔ ہوس اور خواہش پر پہرے

سمجھاتا ہے لیکن جب کوئی اس پر بھی نہیں مانتا۔ تو درّہ لیکر نکل آتا ہے۔ یگر دین باطل گناہ کے دروازے چوپٹ کھولتا ہے۔ ہوس کی راہیں کشادہ کرتا ہے۔ اور جب اس کے نتائج نکلتے ہیں تو تقویٰ و طہارت کے غریب کا ڈنڈا لیکر نمودار ہوجاتا ہے —— قوت کا استعمال دونوں کرتے ہیں۔ مگر کتنے مختلف انداز سے؟

ماحول کی اہمیت

تہذیب فرنگ جس قسم کا ماحول پیدا کرتی ہے۔ اس کا تذکرہ اوپر کی سطور میں ہوچکا ہے۔ مگر اسلامی تہذیب کی فضا کو دیکھنا ہو۔ تو مدینہ منورہ کی اس زندگی کو دیکھئے جو خیر القرون میں تھی۔ اس کا ضابطہ قرآن مجید اور ارشادات رسول تھے۔ اور نمونہ عمل اسوہ رسول ؐ اور حیات صحابہ ؓ جو بات کتاب میں لکھی ہوئی ملتی تھی۔ وہی زندگی کی صورت میں مدینہ کی پوری فضا میں گھلی ہوئی ملی ہوئی۔ جذب شدہ نظر آتی تھی۔

مولانا ابوالحسن ندوی استاذ ندوۃ العلماء نے کیا پاکیزہ بات کہی۔ کہ مدینہ منورہ کی زندگی میں اور موجودہ دور کے مسلمانوں کی زندگی میں فرق یہ ہے۔ کہ مدینہ منورہ کی زندگی میں لوگ جو کچھ سنتے اور پڑھتے تھے۔ اسی کا نظارہ عمل میں دیکھتے تھے۔ قرآن مجید میں صدق اور سچائی کی تعریف آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ سچائی نجات دلاتی ہے۔

اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے مسلمان دیکھتے تھے۔ کہ رسول اللہ اور آپ کے دوست سب سچے اور راست باز ہیں۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ سچائی کے سبب یہ لوگ کامیاب و کامران ہیں۔ اور جھوٹے کے لئے یہاں زندہ رہنے کی گنجائش نہیں۔ اس لئے صدق اور راستبازی کی قدر و قیمت ان کے دلوں میں راسخ ہو جاتی تھی۔

مگر آج کتاب و سنت کے چند لمحات کے مطالعے میں ہم جو کچھ پڑھتے ہیں۔ بقیہ زندگی میں اس کی کوئی تصدیق نہیں پاتے۔ حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ سچائی نجات دلاتی اور جھوٹ ہلاک کرتا ہے۔ مگر ماحول کا یہ حال ہے کہ وہ جھوٹوں کو ابھارتا اور سچوں کو گرانا چاہتا ہے۔ پھر تعلیم حق کا دل پر کیا اثر ہو ——— دین حق کی صداقتوں کو روشن کرنے کے لئے ضرورت ہے۔ کہ ان کے مطابق زندگی کا ماحول پیدا کیا جائے۔ تاکہ جب طالب علم تعلیمات کتاب و سنت کا مطالعہ کریں۔ تو مدرسے سے باہر نکل کر وہ ان کا عملی نمونہ دیکھیں۔ اور وہ ان کی طبیعتوں میں راسخ ہو جائیں۔

مشین یا انسان

ایک حامی اشتراکیت کے عبرت انگیز الفاظ پڑھیئے:۔

"اشتراکیت کے ماتحت تمام تر حقوق اور مفادات اشتراکی ریاست کی ضروریات پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ افراد یا گروہ کسی قسم کی آزادی

نہیں رکھ سکتے۔ ان کا کام مشینوں کی طرح عمل کرنا ہے۔ انہیں آزادانہ طور پر سوچنے کا کوئی حق نہیں۔"

یہ اشتراکیت کی حدود ہیں۔ یعنی آپ کوئی عمل نہیں کر سکتے۔ کوئی بات زبان پر نہیں لا سکتے۔ قلم کو حرکت نہیں دے سکتے کچھ پڑھ نہیں سکتے۔ کچھ سوچ نہیں سکتے ——— ان تنگ حدود کے باہر جو ریاست نے مقرر کر دی ہیں آپ کو جب اور جتنی دیر کے لئے چاہا جائے گا۔ آپ کے ہاتھ پاؤں، زبان، قلم، دل و دماغ رکھنے والے اعصاب کے مرکزی بٹن حکومت کے قبضہ میں رہیں گے۔ وہ جب اور جتنی دیر کے لئے اور جس مقصد کے لئے چاہے گی آپ کو استعمال کرے گی۔ اور اس پر یہ کہ:۔

"نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے"

مگر اسلام شخصی آزادی کی وہ کم سے کم مقدار افراد سے سلب کرتا ہے جسے فرد کے پاس چھوڑ دینے سے "فرد کے لئے آزادیاں سامان فساد" ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ آپ کو آپ کی انسانیت کی خاطر بالکل آزاد چھوڑ دیتا ہے۔

پھر کہئے آپ مشین بننا پسند کرتے ہیں یا انسان؟

زندگی کی یلغار

ایک معروف ادیب لکھتے ہیں:۔

"قوم کے شاعر اور ادیب اب اپنے بالاخانوں اور نہ خانوں میں کب تک مقفل ہو کر زندگی بسر کر سکتے ہیں"

زندگی کی جنگاہ سے بھاگنے والوں نے کتنی پناہ گاہیں مہیا کی ہیں —— ملحدوں نے فنون لطیفہ، شاعری، مصوری، موسیقی اور رقص کے سایۂ دامن کو انتخاب کیا۔ اور خدا پرستوں نے محراب مسجد یا خانقاہ کی اوٹ لی۔ مگر زندگی کی یلغار ہے کہ ان ساری قلعہ بندیوں کو توڑتی جا رہی ہے اور انسان کے تعاقب میں کہیں رکتی تھمتی نہیں ع

"جہاں تو جائیگا یہ تیری دنیا ساتھ جائے گی"

ہاں "قبر" اس کی دسترس سے باہر ہے۔ قبر میں اترنے سے پہلے وہ انسان کو اس کی اجازت نہیں دیتی کہ زندگی سے ہٹ کر وہ زندگی بسر کرے اسلام زندگی کی اسی فطرت کا وکیل ہے اور اس کا مطالبہ یہ ہے کہ حیات کی پہنائیوں کو گوشوں اور کونوں میں نہ سمیٹو، اسے ٹکڑوں میں تقسیم نہ کرو اور اسے متعدد اقتداروں کی جولانگاہ نہ بناؤ!!

"برلبش آیت و بت در آغوش"

اوپر کا مصرعہ ماہر القادری کا نتیجۂ فکر ہے۔ اس میں موجودہ دور کے "شیخ" کا لفظی کارٹون مرتب کیا گیا ہے

دین و دنیا بہم آمیختہ شیخ   برلبش آیت و بت در آغوش

یہاں "شیخ" کے لفظ سے خواہ مخواہ مولوی مراد لینے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہر مسلمان مولوی ہے۔ لٹکا ہیں جو ہے سو باون گز کا ـــــ "مسلمان صاحب" کا نقشہ ملاحظہ ہو۔ گود میں بت کافر کو لئے ہوئے ہیں اور اسے جھوم جھوم کر لوریاں دے رہے ہیں۔ لوریاں بھی ایسی ویسی نہیں ـــــ "آیات قرآنی کی لوریاں۔ ذرا اڑوس پڑوس میں دیکھئے کہ فرزندان اسلام نے کیا سماں باندھ رکھا ہے۔

نظام کفر کے عہدے، حرام کاروبار کی آمدنیاں، دشمنان اسلام کے عطا کردہ خطابات، سینماؤں، بینکوں اور شراب خانوں کی ملازمتیں، ہندوں کی خدائی کو چلانے سے حاصل ہونے والی تنخواہیں، ملت فروشی کے صلے میں ملنے والی عزتیں اور عظمتیں، انہیں کے دم سے مسلمانوں کی گھر آباد ہے اور انہیں کو خوش رکھنے کے لئے آیات قرآنی پڑھ پڑھ کر پھونکی جاتی ہیں۔

نام بڑا یا کام

کیمبرج سے پاکستان کے ایک خاص الخاص علمبردار ایک پمفلٹ کے ذریعے ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ موجودہ دور کی دنیا تیسری مرتبہ جس عالمگیر انقلاب سے دو چار ہے۔ وہ "ملت" کو بھی چیلنج کرتا ہے۔ بس سوچ لو، سمجھ لو، اور کچھ کر دکھاؤ! مگر کیا کر دکھاؤ؟ ـــــ سب سے پہلے تو ملت کے تحفظ کے لئے ہندوستان (انڈیا) کو "ڈینیا" سے موسوم کراؤ، جس میں تین مسلم ریاستیں ہوں، یعنی

پاکستان، بانگستان (بنگال)، اور عثمانستان (دکن) اور اس کے بعد وسطی ہند اور بمبئی اور جنوبی ہند کے مسلمانوں کو ذیل کی چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنادو۔ ——— صدیقستان، فاروقستان، میونستان، لفارستان، موپلستان، حیدرستان وغیرہ اور اس کے بعد جو کچھ رہے وہ ہندوستان ہے۔

پھر ان ساری ریاستوں کے مجموعے اور ان کے متعلقات کا وحدانی نام براعظم "پاکیشیا" قرار پانا چاہیئے۔ اس کے بعد عالمگیر الحادی انقلاب سے کوئی خطرہ نہیں ہے!

"نام" سے "کام" لینے والا خوش فکر مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اگر مسلمانوں کی آزاد ریاستیں بن جائیں تو ان کی زندگیوں کو موجودہ دور کے اثرات سے محفوظ کرنے کے لئے ان ریاستوں کے "اسلامی نام" رکھ لینا کافی ہے اصولوں کی فکر بے کار ہے۔ اعمال کی اصلاح تقسیم اوقات اور نظام حیات کی قرآنی تنظیم بے سود ہے ——— جب آپ "پاکستان" کے رہنے والے ہوں گے تو آپ لازماً "پاک" ہوں گے۔ اور فاروقستان اور عثمانستان میں رہینگے تو لازماً فاروق اور عثمان ہوں گے۔

ہندو

دہلی میں ایک اکھنڈ ہندوستان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں صدر مسٹر ساورکر سے لیکر معمولی سے شریک کانفرنس تک نے اعلان کیا۔ کہ

ہندوستان کے بسنے والے سب ہندو ہیں خواہ وہ خود کو مسلمان کہتے ہوں یا عیسائی یا سکھ۔

مسلمانوں کو یہ سن کر سخت اذیت ہوئی ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ کسی دل جلے نے ساورکر اور مونجے کو دو چار صلواتیں بھی سنا دی ہوں، مگر سوچنا چاہئے کہ یہ مجنونانہ قول ساورکر اور مونجے کی زبان پر کیوں آیا۔ کیا ان کو نظر نہیں آتا کہ ہندو اور شئے ہے اور مسلمان اور چیز۔ ہندو وہ ہے جو ہندو دھرم کا پیرو ہو۔ اور مسلمان وہ جو متبع اسلام ہو۔ مگر ساورکر اور مونجے کہتے ہیں کہ مسلمان بھی ہندو ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہیں۔

قومیت کا یہ تصور بالکل کافرانہ ہے مگر اس میں قصور مسلمانوں کا بھی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی ان خصائص سے تقریباً خالی اور محروم ہے جن سے ایک مسلمان ممیز ہوتا ہے۔

زندگی کے اہم ترین شعبے تین ہیں۔ سیاست، معاشرت اور معیشت، اور تینوں کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کا طرز عمل کچھ بھی مختلف نہیں۔ قومیت ہی دونوں کی سیاست کی بنیاد ہے۔ معیشت میں حلال و حرام کی دونوں تمیز نہیں کرتے۔ معاشرت دونوں کی ایک جیسی ہے۔ ان حالات میں محض یہ اختلاف کہ مسلمان مسلمان کے گھر میں پیدا ہوتا ہے اور ہندو ہندو کے گھر میں کوئی مخصوص اہمیت نہیں رکھتا۔ اور اگر ہندو سبھائی مسلمانوں کو بھی ہندو قوم میں شامل سمجھتے ہیں۔ تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔

خانقاہی اسلام

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ان کے یہاں ایک خانقاہ ہے۔ جو ایک بہت بڑے بزرگ سے منسوب ہے۔ معقول آمدنی کی جائداد اس کے لئے وقف ہے۔ ایک روشن خیال سجادہ نشین گدی پر براجمان ہیں جن کا طریقہ یہ ہے کہ احاطۂ خانقاہ میں ڈراما کراتے ہیں۔ اور یہ شغل مقدس شعبان کی آخری تاریخوں میں ہوتا ہے امسال شاہ صاحب پورے خاندان کو ساتھ لیکر ڈراما ملاحظہ فرماتے رہے۔

مکتوب نگار صاحب پوچھتے ہیں کہ کیا یہی وہ فقرائے طریقت اور سجادہ نشینان حقیقت ہیں جن کو نیابت رسول کا حق ہے۔ اور جن کے طفیل اسلام ہندوستان میں پھیلا۔ اور کیا اسلام، ڈراما اور حقیقت و طریقت ایک جگہ جمع ہوسکتے ہیں۔ گذارش ہے کہ اسلام کا جو تصور ہندوستان میں مسلمانوں کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اس میں ہر چیز جمع ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ایک آدمی خدا کی عبادت بھی کرسکتا ہے اور طاغوت کی پرستش بھی۔ اطاعت خدا و اطاعت رسول کا مدعی بھی ہوسکتا ہے اور کفار کو اولوالامر بھی تسلیم کرسکتا ہے قانون الٰہی پر ایمان بھی لاسکتا ہے اور عدالت طاغوت میں قانون طاغوت کے مطابق فیصلے بھی کرسکتا ہے۔ اور فیصلے طلب بھی کراسکتا ہے۔۔۔۔۔

دلق و سجادہ و تسبیح و مصلیٰ۔ درس و تدریس سب حلقوں کا یہی حال

ہے سے

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار ہم مست

لیکن یہ اسلام وہ اسلام نہیں۔ جو حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم لائے اور جس میں ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے۔ جو فسق و فجور کی ممانعت کرتا ہے۔ اور تقویٰ و طہارت کو موجب نجات قرار دیتا ہے۔

عدالت کی مسل

امرت سر کی اطلاع ہے کہ ضلع اور سیشن کی عدالت کے متعلقہ دفتر کی ایک الماری میں جس میں اہم مسلیں رکھی جاتی ہیں اتفاق سے رات کے وقت ایک کتا بند ہو گیا۔ اور رات بھر مسلوں کا مطالعہ کرتا اور ان کو پھاڑ پھاڑ کر پھینکتا رہا۔ صبح کے وقت کلرک نے الماری کا دروازہ کھولا تو کتا ایک زناٹے کی زقند لگا کر بھاگ گیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ کچھ مسلیں ناقابل شناخت ہو گئی ہیں۔ جو لوگ موجودہ نظام عدالت کی حقیقت سے واقف ہیں وہ خوش ہوں گے کہ جس حقیقت پہ نوع انسانی کے تمام افراد مطلع نہ ہو سکے۔ اس کو ایک کتے نے ایک ہی رات میں فاش کر دیا۔ اس نے اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ان مسلوں کے ساتھ صحیح سلوک یہ نہیں کہ ان کو بچا بچا کر حفاظت سے الماریوں میں رکھا جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ ان کو پھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ جس قانون کی بنیاد ہی غلط ہو۔ اس کی عدالتوں کی مسلوں سے امن و اصلاح کی

کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے اور ان کو حفاظت سے رکھنے کا مطلب کیا ہے۔

ببول کے آم

"حکومت الٰہیہ ہو یا پاکستان، دونوں کے قائم کرنے اور چلانے کے لیے اسلامی فکر و عمل والے انسانوں کی ضرورت ہے۔ ورنہ کیا مسلمانوں نے کیا کبھی کسی خطۂ ارضی پر حکومت قائم نہیں کی۔ زمانے نے ان کو کبھی جہانگیری جہانبانی کے تجربے کا موقع نہیں دیا۔ جس طرح جو بونے سے گیہوں اور ببول کے درختوں میں آم نہیں لگتے۔ اسی طرح فکر صحیح اور عمل صالح کے بغیر اسلامی حکومت قائم نہیں کی جا سکتی۔"

ان الفاظ کے ذریعہ علی گڑھ کی اسلامی جماعت کی طرف سے لاہور کے ایک روزانہ اخبار میں مسلمانوں کو اسلامی فکر و عمل کی دعوت دی گئی ہے ارشاد بالکل صحیح ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک طبقہ انگریزوں سے نجات چاہتا ہے۔ دوسرا ہندوؤں سے اور تیسرا پیٹ کے دکھ سے نہ شیطان اور جہنم سے کسی کو خطرہ نہیں ہے۔ نہ حکومت الٰہی کے قیام کی کسی کو فکر ہے الا ماشاء اللہ۔ گیہوں پیدا کرنے کی امید ہی کس کو ہے۔ اور آم حاصل کرنے کی تڑپ ہی کہاں ہے۔ جو تو در کنار، گھاس ہی اگ آئے۔ اور ببول نہیں صرف اس کے کانٹے ہی دستیاب ہو جائیں تو غنیمت ہے ؎

نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

کونسل کی ممبری دلوا دیجئے۔ سرکاری ملازمت کا دروازہ کھول دیجئے۔ اور روٹی کا سامان کر دیجئے۔ اور پھر جہاں جی چاہے لے جایئے۔ سیاسی سربلندی اور اقتصادی خوش حالی کے طلبگار جہنم تک جانے کے لئے تیار ہیں۔

پیٹ کا دکھ

ایک انگریز سیاستدان لکھتا ہے کہ جب تک ہندوستان سیاسی مسائل کو چھوڑ کر پیٹ کے دکھ کا علاج کرنے کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ اس وقت تک اس کا حال ذرا نہ سدھرے گا۔

برطانیہ کے نقطۂ نگاہ سے یہ مشورہ بالکل صحیح ہے۔ اس لئے کہ نہ پیٹ کے دکھ کا علاج ہوگا۔ اور نہ سیاسی معاملات کی طرف توجہ کرنے کی نوبت آئے گی۔ اور ضمیر برطانیہ مزے سے آرام کی نیند سوتا رہے گا۔ پیٹ کا دکھ ایک ایسا مرض ہے جس کا جتنا زیادہ علاج کیا جائے۔ اتنا ہی اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ مرض عشق اور پیٹ کا دکھ دونوں توام بھائی ہیں۔ اسی قسم کی غلط فہمی میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے پیٹ کا دکھ دور ہو جائے گا۔ تو اسلام کی مصیبت زدگی بھی جاتی رہے گی۔ ان کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کا پیٹ اندر سے جڑے ہوئے ہیں۔ تحریک اسلامی کی طرف سے مسلمانوں کو غافل رکھنے کے لئے یہ اپنوں کی اسی طرح فریب خوردہ ترکیب ہے۔ جس طرح انگریز مصنف کا مشورہ مکر و فریب۔

۲۳۰ تک کی گنتی

کہتے ہیں ایک خوبصورت روسی ایکٹرس کے استقبال کے لئے ایک شاندار ضیافت کا اہتمام ہوا جس سے میزبان نے فرمایش کی کہ کوئی گیت گا کر سنایئے تاکہ حاضرین محفوظ ہوں۔ ایکٹرس نے کہا کہ اس موقعے کی مناسبت سے تو مجھے کوئی گیت یاد نہیں۔ البتہ میں اپنی زبان میں کچھ عرض کر سکتی ہوں۔ لوگوں نے خوشی سے قبول کر لیا۔ ایکٹرس نے اپنے دلفریب انداز میں بولنا شروع کیا۔ ہر چند لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر وہ اس کے ہونٹوں کی جنبش، اس کی نگاہوں کی گردش اور اس کے ہاتھوں کی حرکت سے نہایت محظوظ ہوئے رخصت ہونے سے پہلے میزبان نے پوچھا کہ براہ کرم بتایئے تو سہی آپ نے کیا پڑھا تھا۔ روسی ایکٹرس نے جواب دیا کچھ نہیں۔ میں نے صرف ایک سے ۲۳۰ تک گنتی کر دی تھی۔

بالکل یہی حال ہندوستان میں مسلمان رہنماؤں کا ہے۔ ان سے پوچھئے کہ آپ کی منزل مقصود کیا ہے۔ آپ جو نظام سیاست ہندوستان یا پاکستان میں قائم کرنا چاہتے ہیں وہ کیسا ہوگا۔ تو وہ نہایت جوش کے ساتھ کہہ دیں گے کہ ہماری منزل مقصود اسلام کی سربلندی ہے اور ہم اسلامی نظام سیاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمان خوبصورت اور دلفریب الفاظ سنتے ہیں اور لیڈر کے لئے زندہ باد کے نعرے لگا دیتے ہیں۔ مگر اسلامی سربلندی

کا مفہوم نہ ان کو معلوم ہوتا ہے نہ ان کے لیڈر کو۔ لیڈر اور پیرو دونوں کی زندگیاں ان کے دعووں کی تغلیط کرتی ہیں۔

معاشی مسئلہ

ایک زمانہ تھا کہ ضمیر و اصول کو زندگی کے تمام مسائل پر فوقیت حاصل تھی۔ آدمی جان تک دے دیتا تھا۔ مگر ضمیر یا اصول کو قربان کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ مگر تہذیب فرنگ اور نظام باطل کی ہمہ گیر کارفرمائی نے زندگی کے تصورات قدیم کو بالکل بدل ڈالا ہے۔ اب اصل سوال معاش کا ہے۔ یہ جس طرح بھی حل ہو اسے حل کر لینا جائز ہے۔ نئی اخلاقی بنیادوں میں یہ ٹیڑھی اینٹ اس مضبوطی کے ساتھ پیوست ہو چکی ہے کہ اس نے "مسلمات" کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اب کوئی کام کتنا ہی برا ہو بآسانی گوارا کر لیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے ذریعے مسئلہ معاش حل ہوتا ہو۔

کچھ عرصہ ہوا ستیارتھ پرکاش جیسی مشہور دلآزار کتاب کے فریضے جلانے کے سلسلے میں ایک ہندو پرمانند کی کتاب حیات کو راکھ کر دیا گیا تھا اس قتل کے الزام میں نو مسلمان نوجوانوں پر مقدمہ چل رہا تھا۔ ان پر جرم ثابت کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے جو پیرو کار تعینات تھا وہ ایک مسلمان تھا۔ اس نے اپنی ساری قانونی قابلیت اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کر دی کہ یہ نوجوان ہی پرمانند کے قاتل ہیں۔ اگر یہی

بات کوئی اور مسلمان کہہ دیتا تو تمام اسلامی ہند نفرت و حقارت سے لبریز ہو جاتا۔ مگر چونکہ وکیل صاحب سرکاری وکیل تھے۔ اس لئے اصول کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ کہ انہیں ستیارتھ پرکاش کے مسلمان ملزموں پر جرم ثابت کرنے کی کوشش کرنے کا حق حاصل ہے۔ حق نہیں یہ اس کے فرائض میں داخل ہے۔ سوال معاشی مسئلے کا ہے اور اس کو مسلمات کی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہ اصل زندگی کے جملہ معاملات پر حاوی ہے کہ نظام باطل کی بڑی سے بڑی خدمت اس وقت بالکل درست ہو جاتی ہے جب اس کے ذریعے پیٹ کا سوال حل ہو جاتا ہو۔

شیعیت

شیعہ پولیٹیکل کانفرنس نے مسٹر جناح سے دریافت کیا تھا کہ "پاکستان میں شیعہ حقوق کا تحفظ کس طرح کیا جائے گا" مدیر نیشتر و نشتر کو آبادی، انتخاب اور نمائندگی کے جھگڑوں اور اعداد و شمار کی جادوگریوں سے کوئی بحث نہیں۔ وہ تو صرف یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ شیعہ حقوق کی پامالی کا اندیشہ کس سے ہے۔ اگر ہندوؤں سے ہے تو گاندھی جی سے اطمینان طلب کیجئے۔ اور اگر سنیوں سے ہے تو بے فکر رہیئے۔ جہاں تک شیعہ ہونے کا تعلق ہے۔ تبلیغی پروپاگنڈا نے سنیوں کو شیعوں سے زیادہ شیعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ تعزیہ کون بناتا ہے؟ ـــــ سنی! محرم کے جلوس کون نکالتا ہے؟ ـــــ سنی!

اگر محرم میں بلوہ ہو جائے تو کون لڑ مرتا ہے؟ ــــــ سُنی! نعرہ حیدری" یا علی" کون لگاتا ہے؟ ــــــ سُنی! ماہ محرم میں شادی بیاہ کو کون معیوب سمجھتا ہے؟ ــــــ سُنی!

جب یہ حالت ہے کہ سُنی کی کھال کو کرید کر دیکھئے تو اندر سے شیعہ نکل آئے گا۔ تو پھر فرمائیے کہ شیعہ حقوق کو سُنیوں سے کیا اندیشہ ہے۔

آدم اور ابلیس

آدمی کا قاعدہ ہے کہ گناہ وہ خود کرتا ہے۔ مگر لعنت شیطان پر بھیجتا ہے۔ اور شیطان کی عادت ہے کہ وہ آدمی کو گناہ پر ابھارتا ہے اور جب اس سے لغزش ہو جاتی ہے تو دامن جھاڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت برطانیہ کے مدبروں اور برطانیہ کی محکوم اقوام کی ہے۔ ہندوستانی اپنی شامت اعمال سے اختلافات خود پیدا کرتے ہیں۔ قومی، نسلی اور مذہبی تعصبات کی آگ کو خود بھڑکاتے ہیں اور الزام برطانیہ پر لگاتے ہیں۔ وہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔ بات اگر صحیح بھی ہو۔ تو اصل ملزم خود ہندوستانی ہیں۔ جو اس پالیسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

دوسری طرف برطانیہ فلسطین میں خود یہودیوں کو گھیر گھار کر لاتا ہے اور وطن الیہود کی تحریک کی سرپرستی کرتا ہے۔ اور جب عرب اور یہودی

آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے۔ کہ دو قوموں کی کشاکش کا علاج تقسیم کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ مسٹر جان قلبی جہاں ہندوستان کے فرقہ وار مسئلے کا علاج تقسیم ہند میں مضمر قرار دیتے ہیں۔ وہاں فلسطین کے بھی دو حصے کرنے کا مشورہ پیش فرماتے ہیں۔ ایک عربوں کا دوسرا یہودیوں کا ——— ہندوستان کا فرقہ وار مسئلہ تو خیر ہندوستانیوں کی حماقت سے پیچیدہ ہوا۔ مگر فلسطین کے گناہ کی گٹھڑی تو عربوں کے سر پر نہ رکھیے۔ یہ گناہ کی پوٹ تو برطانیہ ہی کا حق ہے۔

یوم اقبال رح

یکم اور ۲ر مئی کو لاہور میں یوم اقبال منایا گیا۔ اسی طرح پنجاب کے اور بہت سے شہروں میں بھی اقبال کے کلام اور پیغام پر تقریریں ہوئیں۔ اور مقالے پڑھے گئے۔ مگر عقیدت کے اظہار کے بے پناہ سیلاب کی حقیقت خود کلام اقبال کے لحاظ سے کیا ہے۔ اس پر لوگوں کو توجہ کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔

قصر سلطانی کے گنبد پر بیٹھ کر ہزاروں ہی عقاب ہیں جو اقبال کا یہ شعر وجد میں آ آکر پڑھتے ہیں ؎

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اور کتنے ہی نوجوان ہیں جو ایرانی قالینوں اور فرنگی صوفوں پر دراز ہو کر

الاپتے ہیں ؎

تیرے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

اور بے شمار طائران لاہوتی ہیں جو روٹی کے لئے پر قینچ ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر جھوم جھوم کر گاتے ہیں ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

بندگانِ خدا کیلئے تین منظر

پہلا منظر

لندن پر بے پناہ گولہ باری ہو رہی تھی۔ برطانوی فوجیں ڈنکرک سے نہایت شرمناک طریق پر پریشانی کی حالت میں مرتی کٹتی اور بھاگتی واپس ہو چکی تھیں جرمن آبدوز بحر اوقیانوس بحر شمالی اور رود بار انگلستان میں بھوکے گھڑیالوں کی طرح برطانوی جہازوں کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ فرانس، پولینڈ، بلجیم ہالینڈ، ناروے سب پر جرمنی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ انگلستان کا آسمان بمبار طیاروں سے تاریک تھا۔ چاروں طرف موت، تباہی، شکست، ذلت ناکامی، منہ کھولے پھر رہی تھیں۔ مگر برطانوی قوم نے ہمت نہ ہاری عورتیں مرد اور بچے تقدیر پر شاکر ہو کر تدبیر کے خلاف جنگ میں مصروف ہو گئے چرچل نے ان سے کہا۔ میں تم کو آہوں آنسوؤں اور خون کی بشارت دیتا

ہوں۔ جواب ملا، یہ بشارت قبول ہے۔ مگر ہار مان لینا، جی چھوڑ کر بیٹھنا اور خود ہی غلامی اور نامرادی قبول کرنا منظور نہیں۔ وقت گزر گیا۔ مصیبت ٹل گئی۔ آہیں مسکراہٹوں میں، آنسو قہقہوں میں اور حزن بادہ عیش میں تبدیل ہو گیا۔

دوسرا منظر

جرمنی اور اس کے حلیف پورے یورپ پر چھا گئے۔ ہسپانیہ کی مغربی سرحد سے چل کر روس کی مشرقی حدود تک اور افریقہ کے مغربی ساحل سے لیکر وہاں جہاں عقبہ نے اپنا گھوڑا ڈال کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ اور کہا تھا کہ پروردگار اب آگے یہی زمین ختم ہوتی ہے۔ اور سمندر شروع ہوتا ہے۔ اس لئے بادل ناخواستہ واپس لوٹتا ہوں۔ ورنہ قسم ہے تیرے جلال کی اور اپنی جوانی اور شجاعت کی کہ تیرے دین کو پھیلاتا ہوا آگے ہی آگے چلا جاتا) افریقہ کے مشرقی حصے تک جہاں کسی زمانے میں حضرت عمروؓ بن العاص مسیحی بطریقوں سے نبرد آزما ہوئے تھے جرمنی کا علم فضائیہ اسپیٹ کی خبر لا رہا تھا۔

تیز رفتار و فیروز مندی کی ان بلندیوں پر ہٹلر اور اس کی قوم پرواز کر رہی تھی۔ جو تاریخ میں آج تک کسی نجیب افراد انسانی نے نہیں کی۔ مگر کایک پانسہ پلٹا۔ محوری سیلاب نے اپنے مرکز کی طرف لوٹنا شروع کیا۔ تمام مفتوحہ علاقہ ایک ایک انچ کر کے چھن گیا۔ لاکھوں آدمی مارے گئے۔ بیحساب سامان حرب

تباہ ہو گیا۔ حریفوں نے چاروں طرف سے بے پناہ یورش کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جرمنی عرش کی بلندیوں سے فرش کی پستیوں پر آگرا۔ ایک طرف سے روسیوں نے مشرقی پرشیا کی حدود میں قدم رکھا۔ دوسری طرف سے امریکہ و برطانیہ جرمنی کے اندر داخل ہو گئے۔ تباہی، شکست، ذلت آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگیں —— اس وقت گوبلز نے تقریر کی اور کہا۔ ہٹلر کو اپنی فتح کا جتنا یقین ہے۔ اتنا کبھی نہ تھا۔ ہمارا لیڈر طوفان جنگ میں چٹان کی طرح کھڑا ہے۔

تیسرا منظر

ہندوستان میں اسلام مظلوم ہو گیا۔ اس کے پیروان دعوت اقتصادی، خوش حالی، یورپ کی جمہوری نقالی، نظام باطل کی خدمت اور حصول حکومت و سلطنت کے دلفریب مشغلوں میں مصروف ہو گئے۔ بندگان حق کا ایک مختصر سا گروہ اٹھا۔ اس نے کہا۔ جمہوریت، اشتراکیت، اور آمریت کے پرستارو حکومت و فرمانروائی کے طلبگارو! ترقی و اقبال کے تمنائیو! مال و منال کے شیدائیو! اسلام کی خبر بھی ہے؟ اس نے تمہارے سامنے تمہارا نصب العین بھی رکھ دیا ہے۔ اور طریق کار بھی پیش کر دیا ہے۔ آؤ خدا کی زمین پر نظام حق قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔

جواب ملا۔ کہ ارشاد بجا۔ مگر زمانہ ان باتوں کے لئے سازگار نہیں، جب

چاروں طرف باطل کی یورش ہو، جب شیطان کا تخت جلال ساری دنیا پر بچھ چکا ہو، جب طاغوت کے بادل آسمان پر پھیل چکے ہوں۔ اس وقت یہ خیال کہ اسلام کو پھر دنیا پر قائم کیا جا سکتا ہے۔ ایک خیال خام ہے، جنہوں نے "پہلے ہندوستان کو آزاد کرالیں پھر اسلام کی خدمت کریں گے۔ پہلے پاکستان بنالیں پھر دین حق کو بھی قائم کر لیا جائے گا" یہ زمانہ سید احمد شہیدؒ اور اسمٰعیل شہیدؒ کا نہیں۔ اور اگر ہوتا تو پھر بھی کیا تھا۔ ناکامی، شکست، شہادت اور کیا؟

ہندوستان کے مسلمان اسلام کو دنیا پر از سر نو دین غالب کی حیثیت سے قائم کرنے سے جس طرح مایوس ہیں، ہتھیار رکھ کر باطل کے سامنے جس طرح سر جھکا چکے ہیں۔ اس کو دیکھو۔ اور پھر حیرت سے ——— پیروان باطل کو بڑا خدا کر

ان الذین قالوا ابناء اللہ کا دعویٰ کرنے والے راہ فرار اختیار کر رہے ہیں اور انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ مارنے والے "ثم استقاموا" کا نقشہ دکھا رہے ہیں۔ حالانکہ پیروان باطل اگر فتحیاب بھی ہو جائیں تو صرف حیات دو روزہ کی سربلندیوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اگر شکست کھا جائیں تو خسر الدنیا والآخرہ! مگر پیروان حق جیتے رہے تو غازی مر گئے تو شہید۔ اصحاب الجنۃ ہم فیہا خالدون۔

"ہمارا پاکستان"

ایک دوست مشورہ دیتے ہیں کہ کوشش میں پاکستان کی پرزور حمایت

کرنی چاہیئے۔ کیونکہ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے لئے بھی بہر حال پاکستان کی ضرورت ہوگی۔"

ہم پہلے ہی پاکستان کے پر جوش حامی ہیں۔ مگر ہمارا پاکستان خطۂ زمین کی بجائے بندگان خدا پر مشتمل ہے۔ مسٹر جناح کو ہندو اکثریت سے اندیشہ ہے مگر ہمیں دین باطل کا خطرہ ہے۔ وہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہند و علاقہ سے علیحدہ کرلینا چاہتے ہیں۔ مگر ہم خدا کے بندوں کے صالح عنصر کو الگ کرنے کے آرزو مند ہیں۔ تاکہ جس جگہ وہ آباد ہوں وہاں صحیح معنی میں حکومت الٰہیہ قائم ہو جائے۔

زمین کا خطہ بے جان شئے ہے۔ اس میں خدا کی حکومت بھی قائم کی جاسکتی ہے اور شیطان کی بھی۔ مگر بندگان حق زندہ و فعال ہیں۔ وہ جہاں ہوں گے وہاں صرف حکومت الٰہیہ قائم ہوگی۔

ہمارے دوست کا خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں سے الگ ہونے ہی حکومت الٰہیہ قائم کرلیں گے۔ گویا حکومت الٰہیہ قائم کرنے میں صرف اس لئے دیر ہو رہی ہے۔ کہ ہندوؤں کی چیرہ دستی نے مسلمانوں کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ اگر ایسا ہے تو افغانستان، ایران اور ترکی میں مسلمانوں کو خدا کی رعایا بننے اور نظام اسلامی قائم کرنے میں کون مانع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت الٰہی سے مراد کوئی مخصوص طرز حکومت نہیں بلکہ یہ ہے کہ پوری انسانی زندگی قانون الٰہی کے تابع ہو جائے۔ اور ایسی حکومت ایک غلام پر بھی قائم ہو سکتی ہے اور آزاد پر بھی، اور ایک غلام بھی اس کا باغی ہو سکتا ہے اور آزاد بھی۔

کارِ دشوار

لکھنؤ کی اطلاع ہے کہ ایک قریب کے موضع میں ایک فقیر رمضانی نے گھریلو زندگی کی ناخوشگواری سے تنگ آکر دوسری بیوی کرنے کا ارادہ کیا۔ جب اس ارادے کی اطلاع اس کی پہلی بیوی کو ملی تو وہ اپنے گھر کے چھپر پر چڑھ گئی اور اس میں آگ لگا دی۔ آگ کے شعلوں کو موسم گرما کی تیز ہواسے اور بھڑکا دیا۔ اور وہ کود کود کر پڑوس کے گھروں میں بھی جا پہنچے۔ اور ان کو سطح زمین سے ملا دیا۔ اس قصبے میں تین جانیں ضائع ہو گئیں۔

یہ فطرت انسانی کا ایک معمولی کرشمہ ہے آدمی جب جوش میں آتا ہے تو اپنے گھر کو بھی آگ لگا دیتا ہے۔ جب اس کے دل کی دنیا تباہ ہو رہی ہو تو اسے اس سے کیا بحث کہ گھروں کی دنیا آباد ہے یا برباد ـــــــ ذرا فطرت انسانی کے اس راز کو نظام حیات پر پھیلاؤ اور پوچھو کہ زندگی کے نظام حق کی راہ میں اگر نظام باطل حائل ہے تو اس کو برقرار رہنے کا کیا حق ہے۔

گفتند جہان ما آیا بتو مے سازد　　گفتم کہ نمے سازد گفتند کہ برہم زن

لیکن یہ کام عیش و آرام کے گھروندوں میں بیٹھ کر نہیں ہو گا۔ سب سے پہلے اپنی زندگی کی مصلحتوں کے پھوس میں آگ لگا دینی پڑے گی۔ دنیا میں کتنے پیروی حق کے مدعی ہوں گے جو زندگی کی معمولی ضرورتوں کی خاطر ساری دنیا کو آگ میں جھونک دینے کے لئے تیار رہوں گے۔ لیکن اگر یہی

بات ان سے خدا کے دین کی اقامت کے لئے کہی جائے تو وہ عذر کریں گے کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔

گناہ و ثواب

کچھ عرصہ ہوا ایک مالدار سکھ عورت اور ایک دولتمند تعلیم یافتہ مسلمان مرد نے زندگیوں کے مختلف دھاروں کو ایک ہی وادی میں بہا دیا یہ گنگ و جمن کچھ عرصے تک پہلو بہ پہلو بہتے رہے۔ ان کی تہ سے دو موتی لڑکوں کی صورت میں بھی برآمد ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے رُخ الگ ہو گئے۔ عورت کے دریا کا بہاؤ تیز تھا۔ وہ دونوں موتیوں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ مرد نے عدالت انگریزی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مقدمہ ہائی کورٹ تک پہنچا ایک جج نے فیصلہ دیا کہ مرد کا دعویٰ صحیح ہے۔ یہ عورت مسلمان ہوئی پھر بیوی بنی اور ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس لئے لڑکے خاوند کے حوالے کئے جائیں۔ لیکن اس پر دو ججوں نے پھر نظر ڈالی اور قرار دیا کہ عورت کا بیان درست ہے۔ نہ یہ عورت مسلمان ہوئی اور نہ بیوی بنی بلکہ دونوں بغیر نکاح و زواج کے باہم زندگی بسر کرتے رہے۔ لڑکے ضرور اس مرد کے صُلب سے ہیں۔ مگر وہ ماں کے پاس رہینگے۔

ایک ہندو معاصر اس واقعے پر سوال کرتا ہے کہ قانون نے تو فیصلہ دیدیا۔ لیکن مجلسی اور سماجی اخلاق اس کے متعلق کیا کہے گا۔ اگر واقعہ یہی ہے

کہ یہ مرد اور عورت بغیر نکاح کے اکٹھے رہتے تو مجلسی اخلاق کو کیا ہو گیا۔ انہوں نے اتنی دیر تک اس صورت حال کو کیوں برداشت کیا۔ لیکن یہ تہذیب فرنگ کا دور ہے۔ اس کے نزدیک بدکاری اس وقت بدکاری ہے جب رضامندی سے نہ ہو۔ رضامندی سے جو گناہ کیجئے ثواب ہے۔ اور ابھی تو ابتدا ہے۔ اگر اس تہذیب کا شیشہ چور نہ کیا گیا تو خدا جانے کیا کیا دیکھنا پڑے گا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان واقعات پر ناک بھوں سب چڑھاتے ہیں تاہم ہم اسی راہ پر جاری رکھتے ہیں۔ جہاں یہ واقعات ہر روز نمودار ہوتے رہتے ہیں دوسروں کو تباہ ہوتے دیکھتے ہیں۔ افسوس کرتے اور ملامت کے تیر برساتے ہیں۔ مگر خود وہی مشاغل جاری رکھتے ہیں۔ ان کا گمان ہوتا ہے کہ قانون الٰہی ہمارے معاملے میں اپنا طریقہ بدل چکا ہے —— مگر یہ بڑی خود فریبی ہے۔

حیاتِ اُخروی

کہتے ہیں سائنور مسولینی کی بیٹی ایڈا آج کل سوئٹزرلینڈ کے ہوٹلوں میں رقص و نوشی کے کمالات دکھا رہی ہے۔ اور اس کے حسن عالم شوب کے مشتاق اس کی ایک جھلک دیکھ پانے کی خاطر اس طرح ہجوم کر رہے ہیں کہ پولیس کو ان کے اخراج کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ یہ عورت کاؤنٹ چیانو کی بیوی تھی۔ مسولینی کو داماد کے خلاف غداری کا شبہ ہوا۔ اور اس نے اسے موت کی سزا دیکر اپنے ہاتھ سے اپنی بیٹی کو بیوہ بنا دیا۔

انقلاب ایام! مسولینی بھی کچھ مدت کے بعد غداری ہی کے الزام میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اور اس کی بیٹی کے سر سے باپ کا سایہ بھی اُٹھ گیا۔ اس اثناء میں ایڈا کا ملک اتحادیوں کی فاتحانہ یلغار اور جرمنوں کی بے تحاشہ مدافعت سے ایسا پامال ہوا کہ اس کی زندگی کی خوش حالی کا ٹھاٹ یکسر الٹ گیا ــــــ مگر اتنے شخصی، خاندانی، سیاسی اور قومی انقلابات دیکھنے والی عورت کی آنکھ سے آنسوؤں کی جھڑی تو کیا لگتی وہ اُلٹا داد عیش و نشاط دینے میں مصروف ہو گئی۔ اور اپنے ہی فوت شدہ خاوند کے ایک دوست کے ساتھ لہو ولعب میں غرق ــــــ آخروی زندگی سے بے خبر اور بے اعتقاد ہونے کا یہ بالکل قدرتی، فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ اگر زندگی یہی ایک زندگی ہے۔ تو پھر باپ خاوند اور ملک کی بربادی پر آنسو بہانا سب سے بڑی حماقت ہے۔ بلکہ خوب داد عیش دینی چاہیئے۔ اور ہمیں تعجب ایڈا پر نہیں بلکہ ان لوگوں پر ہے جو حیات آخرت، جزائے اعمال، حساب محشر، قیام قیامت، جنت و دوزخ، اور عذاب و نجات کا یقین رکھتے ہیں۔ مگر زندگی اس طرح گذارتے ہیں گویا ان میں سے کوئی شے حق نہیں۔

زہر کے پیالے

گذشتہ نومبر پنجاب کے "اسلامی" حلقوں میں اس امر پر ہیجان برپا ہوا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے وہر و لیست میں غیر مسلموں کو پہلے سے زیادہ دخل مل گیا ہے پہلے

صرف مسٹر سنگھ وار جسٹرار تھے۔ اب ان کو ایک نائب بھی دیدیا گیا ہے۔ جو سکھ ہے۔
اس کے علاوہ امتحانات کی نگرانی کے لئے ایک نیا عہدہ پیدا کیا گیا ہے اور اس
پر بھی ایک سکھ کو تعینات کر دیا گیا۔ غرضیکہ پاکستان میں ہندو راج کے اس قیام
پر انتہائی تشویش کا اظہار کیا گیا۔

ایک دوست نے ہم سے بھی فرمائش کی ۔ کہ اس "ظلم عظیم" کے خلاف
احتجاج کریں۔ آخر "کوثر" کس روز کے لئے ہے ـــــ لیکن ہم حیران ہیں کہ ہم
کس "ظلم عظیم" کے خلاف احتجاج کریں۔ اس "ظلم عظیم" کے خلاف کہ ایک ایسے
سلسلہ تعلیم میں جو اسلامی تعلیمات و روایات کو پامال کرنے کی بہترین خدمت
انجام دے رہا ہے۔ غیر مسلم کیوں زیادہ سے زیادہ اس کے چلانے میں حصہ
لے رہے ہیں۔ اور اس کار خیر میں مسلمان بھی کیوں بڑھ بڑھ کر قدم مارنے سے
محروم ہیں۔ ملت کے نونہالوں کو زہر کے پیالے پلانے کی خدمت ساقی گری
پر کلبوپال سنگھ اور نرانگد پال سنگھ کیوں مامور ہیں۔ بشیر احمد اور اشفاق الرحمن
کیوں تعینات نہیں۔ یا اس "ظلم عظیم" پر کہ مسلمان اس اسلام کش نظام تعلیم
کو ختم کرنے کے لئے کیوں جد و جہد نہیں کرتے۔ اور اسلام اور مسلمانوں پر کیوں
ظلم عظیم کر رہے ہیں۔

براہ کرم پہلے اس سوال کا جواب دے دیجئے۔ اس کے بعد "کوثر" خدمت
احتجاج سر انجام دے گا۔

. . . .

نکل جاؤ

ہندوستان کے متعلق ایک انگریز سیاح بیورلی نکلسن نے ایک تلخ و ناگوار کتاب لکھی ہے۔ جس میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ ایک بار مجھے دہلی جانا پڑا۔ وائسرائے نے اپنی کار میرے لئے بھیج دی تھی۔ جب میں نے قلی کو پیسے دینے کے لئے کار سے سر باہر نکالا۔ تو میری نظر سامنے کی دیوار پر پڑی جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔ "ہندوستان سے نکل جاؤ"۔ میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے قریب ازراہِ ڈرائیور کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ کار روک کر مجھ سے یہ نہ کہہ دے کہ "نکل کر اپنے وطن کو بھاگ جاؤ"۔ لیکن میں نے دیکھا کہ کسی راہرو نے ان الفاظ پر غور نہ کیا۔ تاجر، فوجی، مزدور، عورت، مرد سب اپنے اپنے کاروبار کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔

اس تنبیہ میں ہندوستان کی المناک غلامی کا راز پنہاں ہے۔ کانگرس نے سنہ ۴۲ء میں انگریزوں کو "حکم" دیا کہ "ہندوستان سے نکل جاؤ" مگر اس کے باوجود کہ اس کی آواز سے سارا ہندوستان گونج اٹھا۔ عملاً گنتی کے چند آدمیوں کے کانوں سے آگے یہ آواز نہ گئی۔ لوگوں نے نعرہ مارا "انگریزو ہندوستان سے نکل جاؤ"۔ مگر ان کے جسم، ان کے دست و پا سب انگریزی اقتدار کے وجود کے ساتھ چمٹے رہے۔ نتیجہ وہ نکلا جو نکلا ——— بالکل اسی قسم کی حالت ان لوگوں کی ہے جو منہ سے تو کہتے ہیں کہ نظام باطل کے غلبے کو دور ہونا اور

نظام حق کو قائم ہونا چاہئے۔ مگر وہ نظام باطل کے ساتھ اس طرح چپٹے ہوئے ہیں کہ اس کا ایک حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔

خاک دھول

لاہور کی مشہور تفریح گاہ لارنس گارڈن کے منتظمین نے اعلان کیا ہے کہ باغ کی حدود میں تانگوں اور موٹروں کے داخل ہونے کی اجازت منسوخ کی جاتی ہے۔ اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اس سیرگاہ میں تفریح و تفریح کے لئے آتے ہیں۔ ان کو خاک دھول اور شوروغل سے نجات مل جائے۔ اور امن و سکون حاصل ہو جائے۔

یہ لارنس گارڈن وہی باغ ہے جس میں آئے دن "نہایت خوشگوار" حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ شہر کی وہ تمام آبادی جو تہذیب جدید کی رسیا ہے تزئین و آرائش کے تمام مغربی لوازم کو پورا کر کے جلوۂ عام کی عادی ہے اس باغ میں صبح و شام پہنچ جاتی ہے۔ اور اس کا تعاقب کرنے کے لئے ہوسناک نگاہیں اور گستاخ زبانیں حاضر ہو جاتی ہیں۔ اور دونوں کے تصادم سے ایسے حوادث رونما ہوتے ہیں کہ صنف نازک کی عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور کئی نوجوان طالب علم حوالات کی راہ لیتے ہیں۔

تہذیب حاضر کا یہ نہایت عجیب و غریب فلسفہ ہے۔ اس کی نگاہ صرف ظاہری خاک، دھول اور ظاہری امن و سکون پر رہتی ہے۔ اور حقیقی گندگی

اور قلبی و روحانی امن و سکون اور ...... اخلاقی پاکیزگی کو اس کے نزدیک کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کپڑوں کو مٹی سے بچانے کے لئے وہ ضابطے اور احکام تو صادر کرتی ہے۔ مگر دلوں کو گندگی سے بچانے کے لئے اس کے پاس کوئی حکم و ضابطہ نہیں۔ خود ارباب اختیار کی ہوسناکی چاہتی ہے کہ شیطانی کاروبار کا جلوہ عام ہو۔ یعنی "تقویٰ و طہارت" کی وہ بھی قائل ہے۔ لیکن صرف اس حد تک کہ ہوس کو پاؤں پھیلانے کا موقع حاصل رہے۔

نصب العین

ہز اکسلنسی سر کلاڈ آکن لک سپہ سالار افواج ہند فرماتے ہیں:۔

"میرا نصب العین اور ہندوستان کے موجودہ نظام حکومت کا مقصود یہ ہے کہ ہندوستانی فوج کو بالکل ہندوستانی بنا دیا جائے۔ یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر ہندوستانی ہو جائے۔"

سپہ سالار صاحب نے یہ انکشاف بھی فرمایا کہ "آغاز جنگ میں صرف ۷ سو کمشن افسر تھے۔ مگر اس وقت ان کی تعداد ۱۲ ہزار ہے۔"

"ہندوستانی فوج کو مکمل طور پر ہندوستانی بنا دیا جائیگا" یہ نصب العین محب وطن ہندوستان کے لئے کتنا فرحت آفرین اور نشاط پرور ہے۔ مگر یہ تو ارشاد ہو کہ خود ہندوستانی فوج کا جب کہ وہ مکمل طور پر ہندوستانی ہو جائے گی کیا نصب العین ہوگا۔ اگر اس کا مقصد زندگی ہندوستان کی بجائے برطانیہ

کے عظمت وجلال کے پرچم کو اقصائے ہند اور پہنائے عالم پر بلند رکھنا ہو تو پھر اس میں کیا فرق ہے کہ وہ فوج اجزا ء عناصر کے اعتبار سے ہندوستانی ہو یا برطانی بالکل اسی قسم کے سوفسطے میں وہ لوگ مبتلا ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارا نصب العین مسلمانوں کو آزاد کرانا ہے۔ حالانکہ اگر یہ مسلمان آزاد ہونے کے بعد بھی پرچم کفر و باطل ہی کے پرچم کو بلند رکھنے کا کام کرنے والے ہیں تو برابر ہے کہ وہ آزاد ہوں یا غلام رہیں۔ اسلام جس کے تعلق کی وجہ سے وہ مسلمان کہلاتے ہیں اگر بدستور مغلوب الحال رہے تو مسلمانوں کی خوشحالی و سربلندی سے کیا حاصل؟

وکالت

انگلستان کا ایک مشہور وکیل لارڈ ایلڈن اپنے استاد فن مسٹر ڈننگ کے متعلق ایک واقعے کا ذکر کرتا ہے۔ ڈننگ انگلستان کا بہترین وکیل سمجھا جاتا ہے۔ لارڈ ایلڈن کہتا ہے ایک مقدمے میں میں مسٹر ڈننگ کا نائب یا دکیل تھا۔ ڈننگ نے جب بحث کا آغاز کیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ خود ہمارے ہی مؤکل کے خلاف نہایت زوردار دلائل کا طومار لگا رہا ہے۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ صورت معاملہ ایسی ہی ہے۔ ڈننگ کو خیال نہیں رہا کہ فریقین مقدمہ میں سے وہ کس کا وکیل ہے۔ بالآخر میں نے اس کی آستین کو چھیڑا۔ اس نے میری طرف سر کو ذرا سا جھکا دیا۔ میں نے اس کے کان میں کہا کہ آپ

کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ آپ تو اپنے ہی مؤکل کے خلاف بحث کر رہے ہیں۔ ڈانگ
نے مجھے ایک زور دار ڈانٹ پلائی کہ اس کی غلطی کو جلدی کیول دور نہیں کیا
تھا۔ اور اس کے بعد وہ بحث کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ حضور والا جو کچھ میں
نے عرض کیا ہے۔ بس اسی قدر میرے مؤکل کے خلاف کہا جا سکتا ہے۔ میں نے
زیادہ سے زیادہ مخالفانہ انداز میں تمام دلائل اس لئے جمع کر دیئے ہیں تاکہ
عدالت کو اندازہ ہو سکے کہ میرے مؤکل کی طرف سے کس عمدگی کے ساتھ جواب
دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ڈانگ نے نہایت زور دار دلائل کے ساتھ
ان سب اعتراضات کا جواب دیا۔ جو اس سے قبل عمداً پیش کر چکا تھا
اور مقدمے کو جیت گیا ——— یہ ہے وکالت۔ اور یہ ہے قوانین
باطل اور عدالتہائے باطل کا مآل ———

نماز سیاست کا نقشہ

نماز میں عالم و متقی شخص امام بنتا ہے اور باقی مسلمان مقتدی بن کر کھڑے
ہوتے ہیں۔ اسی طرح نماز سیاست کی امامت دورِ نبوی اور دورِ صحابہ میں
علماء و اتقیاء کرتے رہے ہیں۔ اور عوام اقتداء۔ مگر آج زمانہ بدل گیا ہے۔ آج
کانگریسی اور لیگی دونوں گروہوں کی نماز سیاست کا نقشہ یہ ہے کہ عوام
امامت کر رہے ہیں اور علماء پیچھے کھڑے یہ کہہ رہے ہیں کہ "جو نیت امام
کی سو نیت ہماری"! ——— دونوں مورچوں پر ایک ایک جمعیۃ علماء

جمعیۃ جہلاء کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ اسے جماعتی پالیسی متعین کرنے، مختلف امور مختلفہ میں تصفیہ کرنے اور اسلام اور غیر اسلام کو ممیز کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔

گھوڑے کے آگے ہے اب گاڑی خدا خیر کرے

ایک دلچسپ مشورہ

ایک "مولانا" نے موجودہ طوفان فتن میں "روشنی کا مینار" بنکر یہ مشورہ مسلمانوں کو ارزانی فرمایا ہے کہ الیکشن کے سلسلہ میں کوئی دینی حکم نہ دیا جائے کیونکہ مباح امور میں احکام دینے سے مسلمانوں میں اختلاف و انتشار پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ توجیہ ہے کہ جن لوگوں کو دنیوی سیاست کے دنگل میں کشتی لڑنی ہے ان کا کام ہوگا اگر وہ قرآن و حدیث کو بالائے طاق رکھ کر سیاست مغرب کے فلسفیوں سے استشہاد کریں۔ مگر یہ کہنا کہ از روئے اسلام سیاست کا کوئی نہج تجویز کرنا یا الیکشن کی حیثیت متعین کرنا اور اس میں شرکت و عدم شرکت کا فیصلہ کرنا مباح امور میں سے ہے معلوم نہیں کس سند پر مبنی ہے۔ وضو کرتے ہوئے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی ہو جائے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے انحراف پایا جائے تو وضو وضو نہیں رہتا اور نماز میں اگر قرآن اور حدیث کے کسی فیصلے کی خلاف ورزی ہو تو نماز نماز

نہیں رہتی ـــــ مگر تعجب ہے کہ سیاست ہی اسلام میں ایسی غیر اہم چیز ہے کہ نہ خدا اس میں دخل دیتا ہے، نہ رسولؐ کی سنت اس کا نہج متعین کرتی ہے۔ جدھر منہ اٹھ جائے، اُدھر سرپٹ دوڑ جاؤ کہ:-

"ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں"

اسلام اور تلوار

ایک دوست لکھتے ہیں:-

محض حیاتِ اخروی پر یقین اور دینِ حق کی ہندوستانی پیروی، جانبازی مقابلہ کا ولولہ نہیں پیدا کر سکتی، تا وقتیکہ اعضا میں اس کے لئے سکت اور اہلیت نہ ہو۔ زمانہ راشدہ تک غریب مسلمہ کے پاس بھی ایک گھوڑا اور تلوار ضرور رہتی تھی، عمر اعظم رضؓ کے عہد میں فوجی تربیت ہر شخص کے لئے ناگزیر تھی۔ فن سپہ گری سے ہر مسلمان کے لئے واقف ہونا ضروری تھا، بقول اقبالؒ ؎

آں عزمِ بلند آور، آں سوزِ جگر آور شمشیر پدر خواہی بازوئے پدر آور

یہ صحیح ہے کہ دنیا آج تک فیصلہ نہیں کر سکی کہ انڈا پہلے پیدا ہوا یا مرغی، مگر ہمارا یہ خیال نہ تھا کہ ایمان پہلے آتا ہے یا جہاد، اس کے متعلق بھی کوئی اشتباہ ہو گا۔ بلاشبہ میدانِ جنگ میں لڑنے کے لئے اعضا میں سکت ضروری ہے۔ مگر ایمان باللہ، حیاتِ اخروی پر یقین، اور دینِ حق کی پیروی کے بغیر جانبازی و مقابلہ کا کوئی ولولہ ولولہ ہی نہیں، یہ ولولہ ایک انگریز میں بھی ہوتا ہے جرمن

میں بھی، روس میں بھی اور جاپان میں بھی۔ مگر اصل شے جانبازی و مقابلہ نہیں۔ بلکہ وہ مقصد ہے جس کے لئے جانبازی و قربانی کی جائے۔

پھر یہ بھی صحیح ہے کہ خلافت راشدہ تک ہی نہیں کل تک ہندوستان کے ہر مسلمان کے گھر پر بھی ایک گھوڑا بندھا رہتا تھا۔ اور تلوار گھر میں لٹکی رہتی تھی۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت حق دی تھی تو ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر اور دین کی پیروی کے اسلحہ سے مسلمانوں کو مسلح کیا تھا کیونکہ تلوار تو مکے کے بازاروں میں بھی مل سکتی تھی۔ اور مدینہ کی دو کانوں سے بھی گھوڑے عکاظ کے میلے سے بھی دستیاب ہو سکتے تھے۔ اور مدینے کے نواح سے بھی۔ مگر جس ہتھیار کا نام ایمان ہے وہ صرف بارگاہ نبوی ہی سے مل سکتا تھا۔ پھر تلواریں ٹوٹ بھی جاتی ہیں اور چرائی بھی جا سکتی ہیں۔ مگر ایمان نہ لوٹا جا سکتا ہے۔ نہ چرایا جا سکتا ہے۔

آپ کو عمر اعظم کے عہد کی صرف فوجی تربیت تو نظر آتی ہے۔ مگر وہ اخلاقی کردار اور دینی سیرت آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ جس کی تکمیل ہو چکی تھی۔ اور جس کی تکمیل کے بعد صرف اسلحہ کا حصول اور فن سپہگری کی تحصیل باقی تھی

اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا۔ مگر آپ غلط سمجھے، مرحوم نے عزم بلند اور سوز جگر سے ایمان ہی کو مراد لیا ہے۔ اور بازوئے پدر سے سیرت اسلامی ہی کو۔

قوت بازو، فن سپہ گری۔ تلوار اور گھوڑے پر اسلامی طاقت کو منحصر

سمجھنے والے اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں جس میں غیر مسلم مستشرق ہیں۔ کہتے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا۔ حالانکہ اسلام اس وقت بھی پھیلا جب کہ تلوار موجود نہ تھی۔ اور وہاں بھی نہ پھیلا جہاں اپنی تلوار تھی (جیسے نواح دہلی و آگرہ)

قومی مفاد!

بمبئی کے ایک افسوسناک "واقعے کی بنا پر ہندوستان کی اسلامی صحافت میں ایک ہیجان برپا ہوا۔ ایک مسلمان کے بقول مسٹر عبدالرشید کاردار نے جو فلم اسٹوڈیو بمبئی میں قائم کر رکھا ہے۔ وہ ہندوستان بھر میں واحد فلمی سرکز ہے۔ جس کا مالک مسلمان ہے۔ مگر فوجی حکام کی اسلام دشمنی ملاحظہ ہو۔ کہ وہ اس پر بھی قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ بمبئی میں بیسیوں پرانے اور کامیاب اسٹوڈیو موجود ہیں۔ ان میں سے کسی پر وہ تسلط جما سکتے تھے۔ مگر وہ جو کہا ہے کہ نزلہ بر عضو ضعیف مے ریزد۔ بے چارے "واحد اسلامی فلم اسٹوڈیو" ہی پر قبضے کی نگاہ پڑی۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ فوجی احکام نے یہ بھی نہیں سوچا کہ مسٹر کاردار کو لاکھوں روپیہ کا نقصان پہنچنے کے علاوہ فوجی احکام کے اس اقدام سے مسلمانوں کی فلم انڈسٹری جو ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے ختم ہو جائیگی

اللہ اکبر! ہندوستان میں مسلمانوں کے مفاد نے بھی کتنی وسعت اختیار کر لی ہے۔ فلم انڈسٹری میں آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کی معمولی سی تفصیلات کا تصور کیجئے اور پھر غور کیجئے کہ اس کو تباہی سے بچانے کے لئے احتجاج و

مخالفت مسلمانوں کے لئے کہاں تک جائز ہے۔ لیکن ان امور پر غور کرنے کی فرصت کسے ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ "مسلمانوں کی ترقی" کا ہے۔ یہ ترقی جس طرح ہو کرنی چاہیئے۔ اگر اس سے اسلام کے اصولوں کا تنزل ہو۔ اسلام کی تعلیمات کی مخالفت ہو۔ اسلام کی تعلیم و شرافت کے گلے پر چھری پھیرے اسلام کا پورا "کارخانہ" تباہ ہو جائے تو ہو جائے مگر "مسلمان" کی دوکان پر آنچ نہ آئے ــــــ ہندوستان کے مسلمان اسلام کے متعلق کتنا عجیب و غریب تصور دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

توپ کا گولہ

توپ کا گولہ موت و ہلاکت کی علامت ہے۔ جب یہ توپ کے دہانے سے نکل کر چلتا ہے۔ تو اس کی زد میں اور اس کے دائرے میں جو چیز ہوتی ہے۔ اس کی موت یقینی ہے ــــــ لیکن کیا یہ صحیح ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے مگر ہر جگہ نہیں۔ موت و حیات کا ایک اور قانون بھی ساتھ ہی ساتھ کام کر رہا ہے۔ جس شخص کی موت مقدر ہوتی ہے۔ صرف اس کو گولہ ہلاک کرتا ہے۔ دوسرے کے پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ ابھی کل کا ذکر ہے۔ مسٹر چرچل مغربی جرمنی کے محاذ پر گئے تھے۔ اور جرمنی کی فوجوں کے توپ خانے کے اتنے قریب پہنچ گئے تھے۔ کہ صرف پچاس گز کا فاصلہ درمیان میں رہ گیا تھا۔ یہ فاصلہ ہلاکت کے لئے کافی تھا۔ مگر چرچل کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ اس

لئے توپ کا گولہ بھی بے ضرر ہو گیا۔

اس راز کو نظام باطل کے پرستار بھی جان گئے ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ جو اس راز کو لیکر آئے تھے۔ یعنی پیروان نظام حق۔ ان کو توپ کے گولوں ہی میں نہیں بلکہ اس راہ پر چلتے ہوئے ہر ذرے میں ہلاکت نظر آتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نظام باطل آج دنیا میں نافذ ہے۔ اور نظام حق کے پرستار ابھی ارلبعہ ستہ لگانے اور کامیابی کے امکان و عدم امکان ہی پر غور کر رہے ہیں۔ ——— اور یہ توپ کا ایسا گولہ ہے جس نے ان کو ہلاک کر رکھا ہے۔

پرزے اور مشین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ کہ "تاجر صدوق" (راستباز تاجر) جنت میں میرے ساتھ اس طرح ہو گا۔ جس طرح شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی۔ یعنی قریب ترین پڑوسی۔ نیز فرمایا کہ "الکاسب حبیب اللہ" اپنے ہاتھ سے کام کرنے والا صناع۔ کاریگر اور مزدور اللہ کا دوست ہے۔ (او کما قال) مگر ہندوستان کے مسلمانوں کو صدیوں سے یہ بتایا گیا ہے۔ کہ سب سے اچھا کام حکومت کی ملازمت ہے۔ یہ درس کچھ سر سید مرحوم ہی کا نہیں تھا۔ بلکہ جب سے مسلمانوں کا ذہنی انحطاط شروع ہوا ہے۔ وہ اسی وہم میں مبتلا رہتے ہیں کہ دنیا میں دو ہی معزز کام ہیں۔ ایک حکومت دوسرے ملازمت حالانکہ حکومت اگر صحیح اصولوں پر قائم ہو۔ تو تسکین نفس کے سامان سے

محروم ہو چکی ہے۔ اور ذمہ داری وجہ ابلد ہی سے کہ نفسی لیقیں انگیز احساس سے لبریز۔ اور حکومتوں کی ملازمت بہر حال غلامی و بیا کرتی ہے۔ لیکن دور شاہی کا غرور، اور زرّین پٹکے کی مسرت دماغوں پر ایسی چھائی کہ یہی دو چیزیں مسلمانوں کو محبوب رہیں۔ یہاں تک کہ زوال حکومت کے بعد پہلی چیز غائب ہو گئی۔ اور زندگی کی تمام آرزوئیں دوسری میں مرکوز ہو گئیں۔

دنیا خواب نوشین سے بیدار ہو کر آنکھیں کھول رہی ہے۔ صنعت و حرفت اور تجارت کی طرف راغب ہو رہی ہے۔ ہندوستان کی اقتصادی خوشحالی کا انحصار صنعت و حرفت پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ مگر مسلمان اب تک پرانے ہی چکر میں گم ہو رہے ہیں۔ ان کی زندگیوں کا نصب العین ملازمت ہے۔ اور اب بھی ملازمت ہے۔ جبکہ اس کی مضرت الم نشرح ہو چکی ہے۔ نظام باطل کی مشینری میں فٹ ہونے کے لئے وہ پر زے بیتاب ہیں، جن پر جلی حروف میں لکھا ہے کہ "صرف نظام حق کی مشینری کے لئے بنایا گیا"

دیکھ کے چل!

گذشتہ دنوں کلکتے میں "ہفتہ حفاظت شارع" منایا گیا جس کا مقصد موٹروں کے حادثات کی روک تھام تھا۔ کلکتے میں آمد و رفت کا ہنگامہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ امریکن اور برطانی فوجی لاریاں جب اس کے سینے پر دوڑتی ہیں۔ تو راہ چلنے والوں کی زندگی الامان! چاروں طرف چیخ پکار اٹھتی ہے۔ اور یہ لاریاں تو

خیر کسی راہگذر پر کیا چڑھیں گی۔ یہ راہ گذران کے نیچے آجاتے ہیں ـــــ حکومت بنگال کی کوشش ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنے آقاؤں کے قدموں کے نیچے آکر مرنے کی سعادت سے بھی محروم کر دیا جائے۔

حکومت کا ارشاد ہے کہ فوجی لاریوں والے جو احتیاط کریں گے۔ سو کریں گے۔ مگر راہ چلنے والوں کو محتاط رہنا چاہئے۔ اور دیکھ کر چلنا چاہئے۔ بقول میر تقی مرحوم ع "دیکھ کے راہ چل بے خبر"

مشورہ نہایت اہم ہے لیکن اس زندگی کی راہ پر کون دیکھ کر چلتا ہے۔ آپ اور ہیں کالے اور گورے مہذب اور غیر مہذب سب سفر حیات کو اندھا دھند طے کرنے کے عادی ہیں۔ دیکھ کر تو وہ چلتا ہے جسے منزل پر پہنچنا ہو۔ اور جس کا مقصد ہی راہ چلنے سے صرف چلتے رہنا ہو۔ یہاں تک کہ جسم جواب دیدے اسے اس سے کیا بحث کہ آنکھیں کھلی ہیں یا بند۔ بقول ایک ادیب کے بازار حیات میں ہر شخص ایک لمبا سا بانس اٹھائے تکمیل ہوس کی ڈور لوٹنے کے لئے آسمان کی طرف منہ اٹھائے بگٹٹ بھاگا چلا جارہا ہے۔ ہم شہروں کی سڑکوں پر تو دیکھ کر چلنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ـــ مگر شہر زندگی کی راہ پر اندھا دھند اڑے چلے جاتے ہیں۔

فتح کا راز

حق ہو باطل دنیا میں ان کے فروغ کا ایک ہی قانون ہے۔ اہل باطل

جب اخلاص، محنت، قربانی اور استقلال سے کام لیتے ہیں تو کامیابی کا تاج ان کے سروں پر رکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن اہل حق اگر ان صفات سے عاری ہوں تو قانون الٰہی ان کو پیچھے دھکیل دیتا ہے۔

قرن اول میں صحابۂ کرام کا یہ حال تھا کہ جب ان کے جسم کی بوٹیاں راہ حق میں نوچی جاتی تھیں تو وہ ہر اذیت پر پکار اٹھتے تھے کہ "فُزْتُ بِرَبِّ الْکَعْبَہ" پروردگار کعبہ کی قسم میں فائز المرام ہو گیا ؎

مجرم عشق تو ام مے کشند غوغائیست   تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

لیکن انہی پیکران ایثار و اخلاص کے اخلاف اور جانشین جب موت پر زندگی کو ترجیح دینے لگے اور راہ حق میں تکلیف اٹھانا ان کے لئے دوبھر ہو گیا۔ تو قانون الٰہی نے امامت عالم کا تاج ان کے سروں سے اتار لیا جس کو پیروان باطل نے بڑھ کر اٹھا لیا۔ کہ ؎

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

آج بھی جو لوگ نظام حق کو صفحۂ عالم پر قائم کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ انہیں پروردگار کے سامنے اپنے استحقاق کو ثابت کرنا ہو گا۔ تم خدا کو اس کی جگہ سے ہٹا کر اپنی جگہ پر نہیں لا سکتے بلکہ اگر رضائے الٰہی مطلوب ہے تو اپنی جگہ کو چھوڑ کر اس کی بنائی ہوئی جگہ پر جانا پڑے گا۔

. . . .

راوان کے دس سر

انسان کو اس کائنات ارضی میں اتارنے کے بعد اللہ نے اسے ہدایت نامہ زندگی سے سرفراز فرمایا تاکہ وہ ایک صحیح اور معتدل زندگی گزار سکے۔ افراط اور تفریط کی بھول بھلیاں میں سرگرداں ہو کر اپنے آپ کو شیطان کی اطاعت میں نہ دیدے۔ لیکن اللہ کے مرسل جہاں اپنا فرض ادا کرتے ہیں، دجال بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوتے۔ وہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ انسان کو جھل دے کر بہکایا جائے۔ چنانچہ وہ انہیں ذاتی سرفرازیوں، قومی خوشحالیوں، نسلی سربلندیوں کی حرص کی وادیوں میں پھینک دیتے ہیں۔ اور پھر وہ شیطان کے نقش قدم پر چل پڑتے ہیں۔ اللہ کے دین حق کو چھوڑ کر خود ساختہ دینوں کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو اور دنیا کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی مسلم حنیف ہیں۔

ذرا ہندوستان کے مسلمانوں کا جائزہ لیجئے۔ قادیان سے آواز بلند ہوتی ہے کہ ہمارے پیر کے ہاتھ پر بیعت کرو، چندہ دو اور احمدیت کی تبلیغ کے لئے مبلغ بھیجو۔ اور نظام باطل کی خوب چاکری کرو۔

خاکسار کہتے ہیں اسلام کی سربلندی توپ اور ایٹم بم پر منحصر ہے فوج میں داخل ہو جاؤ۔ چاہے وہ شیطان کے تخت جلال کو دنیا پر بچھانے کیلئے ہی کیوں نہ بھرتی کی گئی ہو۔ عبدالمجید قرشی صاحب پروگرام پیش کرتے

ہیں کہ تبلیغی یونیورسٹی بناؤ۔ تب "مسلمان" ہو گئے۔ مسلم لیگ اعلان کرتی ہے کہ فی الحال ہم اسلام اور قرآن کے احکام پر عمل کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم بیکس بیوہ کی طرح زندگی گذار رہے ہیں۔ ہمارے فارم پُر کر دو اور رجسٹروں میں نام لکھواؤ۔ کیونکہ ہم افق کے پار نظر آنے والی حکومت کو حکومت الٰہیہ بنائیں گے۔ نیشنلسٹ مسلمان وعظ کہتے ہیں کہ ہم نماز پڑھتے روزے رکھتے ہیں۔ لیکن اسلام اور قانون الٰہی کا نفاذ فی الوقت ناممکن ہے۔ اس لئے ہمارا ووٹ دے کر لادینی سیاست کی کشتی لڑو۔ پھر جب حکومت اپنی ہو جائے گی تو ہم اسلام کا جھنڈا ضرور ہمالیہ پر بلند کر دیں گے۔

اللہ اکبر! غریب اسلام نے مسلمانوں کے لئے ایک ہی شاہراہ عمل مقرر کر دی تھی کہ بے چون و چرا اس پر چلو۔ لیکن یہاں ہر فرقے نے اپنے اپنے اغراض و اغراض پورے کرنے کے لئے نئی نئی راہیں اختراع کر لی ہیں۔ اور اس کے باوجود ہر فرقے کو یہ دعویٰ ہے کہ وہی اسلام اور مسلمانوں کا نمائندہ ہے۔ کیا انہوں نے اسلام کو بھی راون کا سر سمجھ رکھا ہے۔ کہ دس طرف سے دیکھو اور دس مختلف چہرے نظر آئیں گے۔

اپ ٹو ڈیٹ دینداری

ایک ساحر "ایک قابل تقلید مثال" کے عنوان سے ایک صاحب کی خدا دہی کا اعلان کرتا ہے۔ کہ انہوں نے تیس روپے عطا فرمائے ہیں۔ وہ تقریب جشن میں

چندہ کا "خیر جاریہ" معاصر موصوف کے "قرطاس ابیض" میں لکھا گیا ذیل میں درج ہے :-

"میر اللہ کا چھ سال تک جنگی خدمات انجام دے کر اب اپنی اصلی جگہ ریلوے ڈیپارٹمنٹ میں آگیا ہے۔ جنگی ملازمت کے دوران میں اپنی اعلیٰ خدمات کی وجہ سے بہت ترقی کرتا رہا ہے۔ اور فوجی ریلوے میں ٹی۔ او کے عہدے پر تعینات ہو کر اس نے مشرق وسطیٰ اور پھر برہما میں کار ہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ اب بخیر و عافیت آنے پر مبلغ ... بطور شکرانہ ... فنڈ کو دیئے ہیں"

اس کے بعد معاصر پورے جلال کے ساتھ دست تقدس بلند کر کے کہتا ہے۔ جزاہم اللہ احسن الجزا۔ اور مبارکباد دے کر دعا کرتا ہے کہ انہیں اور زیادہ خدمت دین" کی توفیق ہو ———— یہ قابل تقلید مثال نمونہ ہے ہماری "اپ ٹوڈیٹ" دینداری کا۔ دینی خدمت کے تصور کا، قابل رشک اسلامی زندگی کا۔

ایک مسلمان نوجوان چھ سال تک فساق و فجار اور کفار و مشرکین اور ان کے نظام حیات کو غالب و قائم کرنے کے لئے جنگی خدمات انجام دیتا رہا۔ اُس نے مشرق وسطیٰ یعنی مسلمان ملکوں میں جا کر برطانیہ کا پرچم اقبال بلند کرنے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ جان جوکھوں میں ڈالدی۔ اور جب وہ شیطان کو غالب کر کے واپس گھر آگیا تو اس کے والد نے شکرانے کے طور پر ایک دینی خدمت کے فنڈ میں تیس روپے عنایت فرما دیئے۔ نظام باطل کی خدمت کر کے سالم و

غانم چھ برس کے بعد آنے پر اگر پروردگار حق کا شکر یہ نہ ادا کیا جائے اور
دین حق کے لئے چندہ نہ دیا جائے تو اور کیا کیا جائے۔

اور پھر اگر اخبار کا ایڈیٹر دست نیاز بلند کر کے اس نوجوان کے جان و
مال کو دعا نہ دے تو اور کیا کرے۔ شیطان کی خدمت سے دنیوی جاہ و
منصب میں ترقی ہوئی۔ اب خدا کو چندہ دے کر جنت خریدی جائیگی سہ
دل کو تھاما اُن کا دامن تھام کے میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے

آسان اور چھوٹا راستہ

مسلمان تو یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ دستور حکومت قطعاً کافرانہ ہے۔ مگر
وہ اس پر تیار نہیں ہیں کہ اس دستور کفر کو جڑ سے اکھیڑنے کی فکر کریں۔ اور
اس کی جگہ دستور اسلام کو قائم کر دیں۔ اب تجویز یہ ہے کہ دستور کفر کے پیٹ
سے دستور اسلامی پیدا کرایا جائے، اور نظام کفر کے درخت کو تباہ کرنے کی
جگہ اس پر نظام اسلامی کا قلم لگایا جائے۔ دستور کفر اور نظام کفر کی تباہی میں
وقت اور محنت کا صرف زیادہ ہے۔ اتنی دیر کون انتظار کرے!

"واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ" کا حکم اسی لئے تھا کہ دین حق کی علمبرداری
کے تقاضے اگر وقت اور محنت اور قربانیاں زیادہ مانگتے ہوں تو مسلمان
ان سے کترا کر حق و باطل کا مخلوطہ نہ بنائیں ۔۔۔۔ مگر اب خدا و رسولؐ کے
راستے سے زیادہ آسان اور چھوٹا راستہ معلوم کر لینے کے بعد صبر کہاں!

الوالامر

"قرآن مجید میں اولی الامر کا تذکرہ ہے، احکام کو نافذ کرنے کے آداب اور خود احکام بتائے گئے ہیں۔ لیکن نہیں بتایا تو یہ کہ اولوالامر کون لوگ ہوں۔ اور کیوں کر بنیں۔"

اسلامی ریاست کے اولوالامر کا یقین جب بھی انبیاء کی طرف سے ہوا یہ بات مقرر ہوگئی کہ اس قسم کے لوگ اس ریاست کو چلا سکتے ہیں۔ ان میں کم سے کم ایمان کے علاوہ علم دین اور تقویٰ کے اوصاف کا ہونا لازمی رہا ہے۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ نہیں بتایا گیا کہ اولوالامر کون لوگ ہوں۔ ہاں انتخاب اور نامزدگی کے نقشے میں اجتہاد کی گنجائش ضرور ہے۔

مسلمان اپنی جماعتوں کے لئے جن جن لوگوں کو اولوالامر بنا رہے ہیں ان کے تحفظ کے لئے سرے سے اس بات سے انکار کر رہے ہیں کہ اولوالامر کے کوئی اوصاف معین بھی ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ کوئی شخص ان کے اعمال پر گرفت نہ کر سکے۔

اسلام کی متحرک سیاست

"زمانے کے حالات کے ساتھ سیاست بدلتی ہے۔ اور رجحانات بدلتے ہیں۔ لہذا حکومت کا کانسٹی ٹیوشن بنانے کی امت کو پوری

آزادی دی گئی ہے۔"

قانون کا سرچشمہ متعین، قانون کی عملی شرح محفوظ، رائے دہندگی کے شرائط مقرر، خلیفہ کے اوصاف اور اس کی حیثیت معلوم، عام انسانی حقوق و ارفع ذمیوں کی حیثیت کا خیال رکھیں ـــــــ ان اصولیات کے اندر اندر اجتہاد کی ایک حد تک جو گنجائش ہے اور ان کے نفاذ کا ڈھانچہ متعین کرنے میں حالات کی ایک ذرا سی رعایت کا جو موقع ہے اس کی بنا پر کہا جا رہا ہے کہ سیاست اسلام ہر دور میں بدلی ہے، مسلمانوں کے حالات بدلتے ہیں اور کانسٹی ٹیوشن امت جس طرح چاہے بنا سکتی ہے۔ کتنا دلچسپ لطیفہ ہے۔ بدو کے اونٹ کی طرح مسلمان گنجائش سے فائدہ اٹھا کر پورے دین پر قبضہ کر لینا چاہتے ہیں

"سرکار کا سکہ"

دارالعلوم کو اپنی اصلی حالت پر لانے کے لئے سرکار برطانیہ کو حکومت ہندوستان کے انگریزوں کی فوجوں کو ایک گھنٹہ رکنا پڑا ـــــــ یہ دارالعلوم کا واقعہ ہے۔ اسی پر ازراہ [illegible] کسی صاحب ذوق نے یہ فرمایا ہے کہ "سرکار کا سکہ" وقت پر خوب چلا ـــ خوب ارشاد ہوا بلکہ ذرا اور گہرائی میں اترنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ دین، ایمان، اخلاق تک پر سرکار کا سکہ چل رہا ہے۔ حکومت پرستی، منافقت اور دنیا داری کے جذبے اگر [illegible] کر کے مذہب کی انگریزوں کو دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ ان کی [illegible]

حرکت اور ان کی رفتار پر بھی سرکاری تسلط غیر شعوری اور شعوری دونوں طرح سے قائم ہے۔

پھر کیا کیا نشانیاں سرکار عالیہ کی جھٹلاؤ گے!

اسلامی حکومتیں

مسلمان مدت سے اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ اسلام سے دور، قرآن سے بیگانہ اور شریعت سے لاپروا اس لئے ہو گئے ہیں کہ غالب و قہار طاقتوں نے ان کے ہاتھ پیر باندھ دیئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے تو وہ زمین کے سینے میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیں اور اسلامی حکومت علی منہاج النبوۃ قائم کر دیں حالانکہ یہ خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس جنت الحمقاء میں بسنے والے واقعات کی دنیا کی ایک جھلک دیکھنے سے بھی کتراتے ہیں کہ مبادا ان کی خیالی جنت حقائق کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے

ڈاکٹر ناظم صاحب (محکمۂ آثار قدیمہ لاہور) حال ہی میں ایران و عراق کے سفر سے واپس ہوئے ہیں انہوں نے ان "اسلامی حکومتوں" کی اسلام دوستی کو مولانا سید سلیمان ندوی کے سامنے اس طرح بیان فرمایا :-

"ان دونوں ملکوں کے مسلمانوں اور مسلمان ہوٹلوں کیلئے اب شراب اور خنزیر گویا حرام ہی نہیں۔ انا للہ"

یہ ہیں مسلمانوں کی اسلامی حکومتیں! جن کے صدر مسلمان ہیں اور جن کے کارندے سارے کے سارے مسلمان۔ جو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہیں اور جن کے ہاتھوں میں دولت، اقتدار اور وہ سب کچھ ہے جن کی حسرت میں ہندوستانی مرے جارہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اقتدار کے حاصل ہوتے ہی وہ شاہراہ اسلام پر سرپٹ دوڑنے لگیں گے۔ یہی وہ عظیم اکثریت والی مسلمان آبادیاں ہیں جو قرآن پر ایمان رکھتی ہیں اور پھر اسلام کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کئے جارہی ہیں۔ اس حقیقت کی موجودگی میں صحیح طرز عمل یہی ہو سکتا ہے کہ آزادی و غلامی سے قطع نظر اقامت دین کی جدوجہد کی جائے کہ اس راہ میں جو قدم بھی اٹھ جائے کامیاب ہے اور اللہ پر اس کا اجر ہے۔ لیکن افسوس کہ یہی وہ بات ہے جس پر ہمارے علماء اسلام کبھی توجہ نہیں کرتے۔

سادہ لوحی

بھولا بھائی ڈیسائی کا انتقال ہو گیا ——— ورکنگ کمیٹی کا ممبر، مرکزی اسمبلی کا لیڈر۔ آزاد ہند فوج کے مقدمے کا پیروکار۔ ایک کامیاب بیرسٹر، شیوہ بیان مقرر، ماہر سیاستدان۔ اس کی تعزیت کرتے ہوئے گاندھی جی کو اسکی دماغی صلاحیتوں، لسانی قابلیتوں۔ اس کی قانونی مہارت۔ اور اس کی علمی فضیلت کا ضرور ذکر کرنا چاہئے۔ مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ گاندھی جی نے ان میں سے کسی شے کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس صاحب کمالات شخص کی صرف ایک خوبی

ان کی نگاہ میں تھی۔ اور وہ یہ ہے کہ باردولی کے کسانوں کی مصیبتوں پر اس کا دل پسیجا اور جس شخص کو ایک عالی مرتبہ سرکاری نوکر رہ کر زندگی گزارنی تھی اور ہائی کورٹ کا جج بن کر اپنا پیمانہ حیات لبریز کرنا تھا۔ اس نے خدمت خلق اور آزادیٔ وطن کو اپنا نصب العین بنا لیا۔

یعنی تحریک وطنی کو ایک اعلیٰ پائے کا رکن اسی وقت ملا جب اس نے حریف نظام کی مشین کا پرزہ بننے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ اس مشین سے الگ نہ ہوتا تو خدمت خلق اور آزادیٔ وطن کی حمایت نہ کر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں باطل سے تعلق رکھنے والی دو مشغولیتوں میں بھی ایک ہی آدمی پرزہ بن کر کام نہیں کر سکتا۔ پھر وہ پیروان حق کتنے سادہ لوح ہیں جو پیروان باطل کی برابر بھی عقل نہیں رکھتے۔ اور کافرانہ نظام کی خدمت میں خون پسینہ ایک کرنے کے باوجود اس حسن ظن میں مبتلا ہیں کہ چونکہ ہم پیروئی حق کے مدعی ہیں۔ اس لئے ہماری خدمت باطل بھی نظام حق ہی کو قائم کرنے کا باعث ہو گی۔

اپنا کام

گاندھی جی اپنے اسی تعزیتی شذرے میں لکھتے ہیں کہ اگر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی قومی سیوا کی راہ اختیار نہ کرتے تو ہائیکورٹ کے ایک جج کی حیثیت میں "اپنا کام پورا کرتے"

یعنی باردولی کے کسانوں کی مصیبت سے متاثر ہو کر اگر انہوں نے قومی

خدمت کرتے ہوئے "اپنا کام" پورا نہ کیا ہوتا توجہ کی حیثیت میں "اپنا کام پورا کرنے" کام کی کوئی نوعیت ہو وہ "اپنا کام ہے" اپنے کام کے اس تصور میں غیر مسلموں کی طرح مسلمان بھی مبتلا ہیں۔ وہ بھی کوئی کام کریں یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام ہی کا کام کر رہے ہیں۔ سوال صرف اہم اور غیر اہم کا ہے۔ ورنہ نوعیت ایک ہی ہے۔ حالانکہ جس طرح آٹے کی مشین جب آٹا پیستی ہے تو نہ مشین اپنا آٹا پیستی ہے اور نہ اس کے پرزے۔ بلکہ وہ مالک کا آٹا پیستے ہیں۔ اسی طرح ایک سرکاری ملازم سرکار کا کام کرتا ہے۔ ایک قومی خادم قوم کا، اور ایک مسلمان اس نظام باطل کا جس کی وہ خدمت کرتا ہے۔

اتحاد المسلمین کی سعی

بعض خوش فکر خیر خواہان ملت نے ایک کانفرنس اس غرض کے لئے منعقد کی کہ مختلف "اسلامی جماعتوں" کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا جائے یعنی سب اپنے موقف سے تھوڑا تھوڑا سرکیں اور کچھ لے کر اور کچھ دے کر ایک ہو جائیں۔

اسلام ایک اور جماعتیں متعدد؟ ——— یہ ماجرا کیا ہے! خدا ایک، نبی ایک، قرآن ایک، کلمہ جامعہ ایک، مقصد حیات ایک۔ اور پھر "تشتت شملہم" کا سماں؟

ہاں خدا ایک ہے مگر اس کو ماننے کے انداز مختلف ہو گئے ہیں! نبی ایک ہے مگر اس کی شرعی حیثیت کو کسی نے کچھ سمجھا، کسی نے کچھ۔ قرآن ایک ہے، مگر

مطالب و معانی کے لحاظ سے ایک قرآن کے کئی قرآن بنے ہوئے ہیں۔ کلمۂ جامعہ ایک ہے مگر اس کے تقاضے مختلف عناصر کے نزدیک مختلف ہیں۔ مقصدِ حیات ایک ہے مگر اسے کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہی راز ہے تحزب و تفرق کا!

مگر کیا یہ تحزب کانفرنسوں اور معاہدوں سے ختم ہو سکے گا؟ جی نہیں! اس کا صحیح راستہ صرف یہ ہے کہ دین کا، خدا کی الٰہیت کا، قرآن کی دعوت کا، اسلامی مقصدِ حیات کا، انبیاء کے طریق کار کا صحیح تصور بالکل اس طرح عالم و عامی تک پہنچایا جائے، جیسے جاہلیت زدگان عرب کے اندر پھیلایا گیا تھا۔ پھر جن جن سلیم الفطرت لوگوں کو یہ تصور اپیل کرے وہ ایک نظمِ جماعت میں منسلک ہو جائیں ورنہ مختلف الفکر اور متفرق الاعمال لوگوں کو خارجی ذرائع سے جمع کرنا وہ "وحدت" پیدا نہ کر سکے گا جو اسلام کو مطلوب ہے۔

لکم ما کسبتم

روسیوں نے "برلن" نامی ایک فلم تیار کر کے اس کی نمائش تباہ شدہ جرمنی کے غمزدہ فرزندوں کے سامنے کی۔ اس فلم میں جرمنی کی شکست کی دردناک داستان کو محفوظ کر دیا گیا ہے، مگر صرف شکست کی داستان ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ جرمنوں کو انتہائی ذلتوں کا سرمایہ دار دکھایا گیا، مثلاً وہ فاتح روسی ٹینکوں کے سامنے روٹی کے لئے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں۔

فلم کی یہ حقیقت معلوم کر کے فاتحین عالم کی شیطانی تہذیب کی انتہائی

کم ظرفی اور کمینگی اور سفلہ پن کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ ایک فاتح کو اپنے مفتوح بہادر حریف کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ ـــــ کاش کہ تم اس کی مثالیں "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" پکارنے والے فاتحِ مکہؐ کی زندگی میں تلاش کرتے!

آخر یہ کیا مردانگی ہے کہ روندے اور کچلے ہوئے دشمن کے سینے میں آگ میں دہکائے ہوئے نشتر بھونکے جائیں! یہ کیا بہادری ہے کہ زنجیر دل میں جکڑے ہوئے ایک قیدی کے منہ پر تھوک دیا جائے! اور یہ کونسی شجاعت ہے کہ کراہتے ہوئے ایک زخمی کا منہ چڑایا جائے۔

آج تم جرمنی کے شرفِ انسانی کو تباہ کرنے پر تُل گئے ہو، آج تم جرمنوں کے سینوں میں تلخ جذبات کی بنیاد رکھ رہے ہو، مگر فتح کے غرور میں یہ نہ بھولو کہ اگر چنگاریاں بوؤ گے تو شعلے کاٹو گے۔ کیونکہ تم کتنے ہی اندھے پن سے کام لو، مکافات کا قانون بہرحال کارفرما ہے۔ اسی قانون کے ماتحت تمہارے کرتوتوں کے صدقے میں آج ۵ سال سے دنیا پر آگ اور خون کی بارش ہو رہی ہے۔ اور اسی قانون کے ماتحت تمہارے موجودہ کردار سے مستقبل دوزخ کی شکل اختیار کرے گا۔

اللہ کا فضل

ہمارے ایک محترم بزرگ اپنی تبلیغی کارروائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمانے لگے۔ کہ انہوں نے ایک مدرسہ کھول رکھا ہے اور اللہ کے فضل سے

ان کے دو ایسے دوست جو حکومت کے اعلیٰ ملازم ہیں صبح اور شام وہاں درس قرآن دیا کرتے ہیں۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کس خدا کا فضل ہے جس کی رو سے ایک بندۂ خدا جس کو خدا نے اپنے ید قدرت سے پیدا کیا سارا دن طاغوت کی چوکھٹ پر جبہ سائی بھی کر سکتا ہے اور شام کو اس کی تعریف و توصیف میں تر زبان ہو کر اس کے فضل کا حقدار بھی ہو سکتا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں سے بائیس گھنٹے تو ہر اس قانون کی پیروی میں صرف ہوں جو قانون الٰہی کو چیلنج کرتے ہیں اور دو گھنٹے خدا کے قانون کی شرح و تفسیر اور درس و تدریس میں صرف کر دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ دنیاوی ساز و سامان کے ساتھ ساتھ نجات اخروی سے بھی بہرہ ور ہو جائیں۔ ایک ہاتھ سے شیطان کو سلام کر لیا اور دوسرے سے رحمٰن کی خدمت میں عرض نیاز ۔ع۔ میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے۔

ہم سوچا کرتے ہیں کہ غیر الٰہی قوانین کے مطابق دن بھر فیصلہ کرنے والے مفسرین قرآن جب اس آیت پر پہنچتے ہوں گے ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون تو وہ اس کے کیا معنی کرتے ہوں گے اور ان کا دل و ضمیر ان کے نہانخانۂ صدر میں بیٹھا ہوا کیا کہتا ہوگا۔

"اصول البلیتین"

اقامت دین کی تحریک پر فتویٰ صادر کرتے ہوئے بعض اوقات علمائے

دین متین و مفتیان شرع مبین اطمینان سے فرماتے ہیں کہ

"ہم اضطرار کی حالت میں ہیں۔ چنانچہ اہون البلیتین کی رو سے ہم اس میں حصہ لیتے ہیں۔"

لیکن کوئی ان سہمے ہوئے بزرگوں سے پوچھے کہ یہ آپ پر اضطرار کی حالت طاری کیسے ہو گئی؟ حرام رزق کا بقدر سد رمق کھا لینا اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جبکہ انسان اپنی روٹی حاصل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرے اور پھر بھی عاجز رہے۔ فاقوں سے اس کی جان لبوں پر آجائے۔ لیکن کیا اضطرار کو قرآن نے اسلام سے بھاگنے کے لئے چور دروازہ بنا کر بھیجا ہے۔ اسلام آپ کو ایسی ٹھنڈی رخصت نہیں دیتا کہ آپ سکون اور چین سے نظام باطل کے ایوان میں بستر استراحت پر دراز ہو جائیں۔ وہ اس لئے نہیں بنا ہے کہ جیسے جیسے آپ کفر کے سانچے میں ڈھلتے جائیں وہ اپنے اندر لچک پیدا کرتا جائے۔

"اہون البلیتین" یعنی دو بلاؤں میں سے چھوٹی مصیبت کو گوارا کر لو کے معنی اگر یہ ہیں کہ اسلام دے کر زندگی قبول کر لو۔ خدا کو دے کر مفاد دنیوی حاصل کر لو۔ مگر سر دھڑ کی بازی لگا کر اسلام کو غالب اور خدا کو راضی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تو یقیناً اقامت دین کی بجائے کافرانہ اور باطل نظام میں بڑھ بڑھ کر حصہ لینا اضطرار ہی نہیں فرض بھی ہے۔ اگر قومی اور وطنی مفاد کا ضائع ہونا بڑی بلا ہے اور دین حق کی پامالی چھوٹی مصیبت۔ تو بلا تکلف چھوٹی مصیبت کو گوارا کر لیجئے۔ لیکن جس کو آپ چھوٹی مصیبت سمجھ رہے ہیں اگر وہی سب سے

بڑی مصیبت ہو تو پھر اھون البلیتین کا ارشاد آپ کو کوئی نفع نہیں دے گا۔
—— غور تو کیجئے پیغمبر خدا نے کیا فرمایا تھا اور آپ کیا سمجھ بیٹھے۔ صحابہ کا "اھون البلیتین" پر عمل یہ تھا کہ انہوں نے اقامتِ دین کے مقابلے میں ہر مصیبت کو ہیچ جانا اور آپ کی تفسیر یہ ہے کہ مفاد قومی کے مقابلے میں ہر مصیبت کو بے حقیقت جانو۔

تحریکِ اسلامی کا مطالبہ

حضرت شیخ احمد سرہندی جنہیں دنیا مجدّد الف ثانی کے نام سے جانتی ہے۔ عہد جہانگیر کے ایک بہت بڑے عہدہ دار خواجہ جہاں کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

اللہ تعالیٰ تم کو سلامتی اور عافیت سے رکھے، اگر کسی شخص کے پاس دین اور دنیا دونوں جمع ہو جائیں تو کتنی اچھی بات ہے مگر واقعہ یہی ہے کہ دین اور دنیا کو جمع کرنا متضاد چیزوں کو یکجا کرنے کے برابر ہے۔ اس لئے طالب آخرت کو ترک دنیا کرنا ہی پڑتا ہے۔ پھر چونکہ موجودہ زمانے میں ترکِ دنیا آسان نہیں بلکہ مشکل ہے، اس لئے ترک حکمی تو ضرور ہی کرنا چاہیئے۔ ترک حکمی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دنیوی امور میں احکام شریعت کے تقاضوں کا محکوم ہو جائے، کھانے میں، پینے میں، رہنے سہنے میں شرعی حدود کو ملحوظ رکھا جائے اور ان کے باہر قدم نہ نکالا جائے۔ اور بڑھنے والے اموال اور چوپاؤں

کی مقرر کردہ زکوٰۃ نکالی جائے، جب احکام شریعت کی پابندی میسر آگئی تو دنیا کی مضرت سے نجات مل گئی اور دنیا و آخرت جمع ہو گئیں۔ لیکن اگر یہ ترکِ کلی بھی اختیار نہ کیا گیا تو اس شخص کا معاملہ خارج از بحث ہو گیا، اس کا حکم منافق کا حکم ہوگا، اور اس کے ایمان کی ظاہری صورت آخرت میں کچھ بھی سودمند نہ ہوگی۔ بلکہ دنیا میں بھی صرف اس کی جان اور مال کو امان حاصل رہے گی۔"

اس ارشاد کے آئینے میں ذرا مسلمان اپنے ایمان و عمل کا چہرہ ملاحظہ فرمائیں اور سوچیں کہ جس قسم کی زندگیاں وہ بسر کر رہے ہیں، ان کا حاصل کیا ہے۔

آج تحریکِ اسلامی کا مطالبہ بھی مسلمانوں سے صرف یہ ہے کہ وہ اپنی زندگیاں حدودِ شریعت کے اندر بسر کریں۔

غلامی کی تازہ قسم

غلامی کی کئی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ کسی قافلے پر ڈاکہ ڈالا۔ اس کے مسافروں کو پکڑا اور بازار میں جا کر بیچ ڈالا۔ دوسری قسم یہ ہے کہ میدانِ جنگ کے قیدیوں کو غلام بنا لیا، تیسری قسم یہ ہے کہ قوم کی قوم پر غلبہ حاصل کیا، اور اس کو اپنا محکوم بنا کر اس کی زندگی کی ہر متاع پر قبضہ جما لیا۔

ان تمام اقسام غلامی میں حاکم اور آقا غلام کی مرضی اسا دے اور عمل پر قابض ہوتا ہے۔ غلام اپنی خودی اور جسم کی قوتوں کو فروخت کر کے اپنے آقا سے دو وقت کی روٹی اور دوسری ضروریات حاصل کرتا ہے۔

مگر یہ سب پرانی قسمیں ہیں، مبغوض ہیں، ناپسند ہیں، ان کے خلاف غلام بغاوت کر چکے ہیں، ان کو اصولاً غلط قرار دے چکے ہیں۔

لیکن ایک "تازہ غلامی" حکمران کی ساحری" سے پیدا ہوئی ہے اس کا نام ہے "کمیونزم" یہ ایک سنہری زنجیر ہے، ایک طلائی جالی ہے، ایک طوق زریں ہے، جسے لوگ شوق و محبت سے اپنے گلے میں پہنتے ہیں، ہاتھوں اور پاؤں کی زینت بناتے ہیں، اور اس کا نام رکھتے ہیں آرائش حیات، کمال زندگی، نصب العین حیات، آزادی، امن فلاح، حالانکہ وہ غلامی کی بدترین صورت ہے، دو وقت کی روٹی، اور تن ڈھکنے کا کپڑا اور ضروریات زندگی کے عوض آزادی ضمیر اور دولت خودی اور جسم و جان کو حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔

حال ہی میں لوئس فشر اور گاندھی جی کے درمیان جو ملاقات ہوئی تھی اس کی روداد میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:۔

"سدھری ہوئی شکل میں میرے اسٹیٹ کا یہ مطلب ہے کہ ہر چیز پر اسٹیٹ کا کوئی حق نہیں، پر روس میں ایسا ہی ہے، وہاں سچ مچ آپ کے جسم پر بھی آپ کا حق نہیں۔ بنا کسی گناہ کے آپ کسی وقت بھی گرفتار

کئے جا سکتے ہیں، وہ آپ کو جہاں چاہے بھیج سکتے ہیں۔"

فرمائیے غلام کو اس سے زیادہ کیا کہتے اور غلامی اس سے زیادہ کیا ہوتی ہے۔

شیطان کا سب سے بڑا ایجنٹ

ایک سینما کا اشتہار ملاحظہ ہو:

"پبلک کے بار بار اصرار پر ایثار و قربانی کی لاجواب تصویر "پہلی نظر" منگوائی گئی ہے۔"

وہ پبلک ہی تو ہے جس کی چشم عتاب کو راضی کرنے کے لئے قومی فیاضات، اجتماعی ضمیر، اور ہمارے سارے ادارے فحش اور گندگی کے جوہڑوں میں غوطے لگا رہے ہیں، اسی پبلک کے اصرار پر عریاں سے عریاں فلمیں دکھائی جاتی ہیں، گندے گانے اس لئے گائے جاتے ہیں کہ لوگ پسند کرتے ہیں فحش لٹریچر اس لئے شائع کیا جاتا ہے کہ عوام اسے سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں، مسلمان لیڈر بے دینی کی راہوں پر اپنے قافلوں کو چلاتے ہیں اس لئے کہ ان کے پیرو انہی راہوں پر چلنا چاہتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ لوگ خدا کے احکام پر عمل کیا کرتے تھے، رسولؐ کے ارشادات کا لحاظ رکھتے تھے، مگر اب خدا اور رسولؐ کی جگہ پبلک نے لے لی ہے۔ پبلک جب فسق و فجور کے جذبے کی تسکین کے لئے سامان طلب کرتی ہے تو اس کی

تعمیل میں پہلی نظر اور دوسری نظر بلکہ ہر ایک نظر پیش کر دی جاتی ہے۔
ضرورت ہے کہ اس پبلک کے اصرار کے بت کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا جائے کہ آج شیطان کا سب سے بڑا ایجنٹ یہی پبلک کا اصرار ہے، اسی سے علماء بہکتے ہیں، اسی سے زعماء بگڑتے ہیں، اور اسی سے جہلا رتباہ ہوتے ہیں۔

مسلمانی کا بیمہ

ایک رفیق نے ہمیں کسی بیمہ کمپنی کا شائع کردہ پمفلٹ بھیجا ہے جس میں آرٹ پیپر استعمال کیا گیا ہے۔ اور بلاک کی رنگین چھپائی۔ یہ پمفلٹ ایک وعظ اور ایک فتوے پر مشتمل ہے جو آیات قرآنی سے خوب مرصع ہیں۔

وعظ کا مفاد تو یہ ہے کہ اسلام نے آدمی پر بیوی بچوں، والدین، اعزہ واقربا، غرباء ومساکین وغیرہ کے جو مالی ومعاشی حقوق عائد کئے ہیں انہیں ادا کرنے کے لئے "بیمۂ زندگی" واحد راستہ ہے۔ اور بیمہ کے اصول شریعت اسلامیہ سے لئے گئے ہیں۔

مگر جن مسلمانوں کو "خدا خوفی" کا "پرانا مرض" لگ گیا ہے وہ اتنے سے وعظ سے کہاں رام ہوتے ہیں۔ وہ تو کہیں گے کہ بیمہ کے کاروبار میں قمار ہے اور ربوا کی آلائش پائی جاتی ہے۔ اور ان کی حرمت ہمارے نزدیک مسلم وثابت ہے۔

ان لوگوں کا "دماغ درست" کرنے کے لئے "کمپنی بہادر" نے اپنے

وعظ کی دُم میں ایک فتوے کا بُندا بھی باندھ دیا ہے۔ یہ فتویٰ اطمینان دلاتا ہے کہ بیمے کے کاروبار میں قمار کی آلائش کا تو محض شبہ ہی شبہ ہے۔ کیونکہ قمار میں ایک طرف مال گنوانے کا اور دوسری طرف مال اڑانے کا امکان ہوتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں مال آتا ہے جاتا نہیں ہے۔ رہا ربوا کا اندیشہ تو قرآن نے ربوا کو حرام نہیں کیا ہے، بلکہ "الربوا" کو حرام کیا ہے جس سے سود در سود مراد ہے۔ مہاجنی سود سے ضرور بچئے۔ لیکن کاروباری سود تو چٹخارے لے لے کر کھانے کے قابل ہے۔

گو یا کمپنی نے "بیمۂ زندگی" کے ساتھ "اسلام و ایمان" کے بیمہ کا کاروبار بھی شروع کر رکھا ہے۔ آپ جو چاہیں کریں آپ کی مسلمانی ہر حال میں سلامت رہے گی۔ اور کمپنی کا فتویٰ جنت دلانے کا ذمہ دار ہے۔

یہ نہایت قابل قدر مثال ہے۔ اب شراب خانوں کے مالکوں، رنڈیوں کے دلالوں اور بھڑووں، کلب گھروں اور ناچ گھروں کے منیجروں اور منشیات فروشوں اور گویوں، سب کو وعظ اور فتوے نشر کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے تاکہ دختِ رز، زناکاری، رقصِ عریاں، صدائے عود و بربط کی حرمت حلت سے بدل جائے۔ اور مسلمانوں کی مسلمانیت کا پورا پورا بیمہ ہو جائے

" انا الحق کہو اور کہیں پھانسی نہ پاؤ "

. . . .

تحفظِ ایمان

ایک عالمِ دین کا یہ رجحان عموماً الم نشرح ہوتا رہا ہے کہ مسلمان کو شرک، کفر اور فسق کے الزام سے حتی الوسع بچانا چاہیئے۔ یعنی اس کے قول و فعل میں نقشہ کیسا ہی غیر مومنانہ کیوں نہ ہو، تاویل کر کے اسے "مقدس" ثابت کرنا چاہیئے، تاکہ اس کا ایمان قائم و برقرار رہے ——— حالانکہ اس طرح شرک، کفر اور فسق کا قلع قمع نہیں ہوگا۔ بلکہ ان بیماریوں کو اور فروغ حاصل ہوگا۔ آخر کسی مریضِ دق کو خون تھوکتے اور کھانستے دیکھ کر، چیچک کے کسی مریض کے بدن پر چھالے پاکر، کسی فالج زدہ کو بے حس و حرکت ملاحظہ کر کے کسی معقول طبیب سے یہ توقع کیونکر کی جا سکتی ہے۔ کہ وہ مریض کو اطمینان دلائے۔ کہ یہ جو علامات تم میں نمودار ہو رہی ہیں، یہ صحت کا ثبوت ہیں؟ کیا فی الواقع اس سے صحت ہو جائیگی؟ اس سے تو الٹا مریض اپنے علاج سے غافل ہو جائے گا۔

ایمان کے صندوقچے کو گھن لگا ہوا ہے اور آپ اس کے مالک سے کہتے ہیں کہ میاں! کوئی فکر نہ کرو، تمہاری متاعِ ایمان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ گھن ایمان کا دشمن نہیں ہے بلکہ سنتری بن کر اس کا پہرہ دے رہا ہے۔ یہ "چرر چرر" کی جو آواز آ رہی ہے یہ "ہشیار باش" "بیدار باش" کے نعرے ہیں۔

بخلاف اس کے ہم ایماندار کو اس گھُن کے خلاف لڑانا چاہتے ہیں جس کی مختلف اقسام کو فسق اور شرک کا نام دیا جاتا ہے۔ کیا صرف یہی طریقہ نہیں ہے مسلمان کے ایمان کے تحفظ کا؟

"الکفر من الایمان"

ایک صاحب ذرا ناصاف حالت میں تھے اور اس پر ہمارے ایک دوست نے اپنے ذوق کے تقاضے سے ان کے سامنے ایک حدیث پڑھی کہ النظافۃ من الایمان (یعنی صفائی ستھرائی جزو ایمان ہے) اس پر صاحب موصوف نے بھی لوہے سے لوہے کو کاٹنے کے لئے جواباً ایک اور حدیث پڑھ دی کہ البذاذۃ من الایمان۔ جس کا اصل مدعا تو کچھ اور ہے مگر موقع کے لحاظ سے اس کے معنی یہ تھے کہ "غلاظت جزو ایمان ہے"۔ یہ تو تھا لطیفہ مگر اس لطیفہ کی سیر بین کی مدد سے ذرا مسلمانوں کی فکری و عملی زندگی کو ملاحظہ فرمایئے کہ وہ کتنی غلیظ ہو رہی ہے!

اس پر آپ اگر انہیں کسی آیت قرآنی سے توجہ دلاتے ہیں تو وہ قرآن کی تردید خود قرآن سے کر دکھاتے ہیں۔ نسل پرستی، کافرانہ سیاست، نظامِ باطل کی خدمت و اطاعت، حرام ذرائع آمدنی ——— بلکہ مغربی جمہوریت، روسی اشتراکیت، گاندھی ازم، ان میں سے کسے "من الایمان" اور "من الاسلام" نہیں ثابت کیا جا چکا۔ حتیٰ کہ صاف

لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض مسلمان استدلالی ہیر پھیر اور لفظی احتیاطوں کے ساتھ "الشرک من الایمان" اور "الکفر من الایمان" کے دعوے منوانا چاہتے ہیں۔

جماعت حق

ہندوستان میں مسلمانوں کے اتحاد کی سب سے آسان صورت یہ سمجھی جاتی ہے کہ آج جو جماعتیں میدان میں ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر اتحاد کر لیا جائے۔ دلیل یہ ہے کہ ایک جماعت حق کی بشارت دی گئی ہے۔ جو امت میں ہمیشہ موجود رہے گی۔ اور چونکہ حق بہر حال انہی جماعتوں میں دائر ہے۔ اس لئے کسی ایک پر اتفاق کر لیا جائے تو وحدت امت کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

وحدت ملت اور تنظیم امت کے ان علمبرداروں سے گزارش ہے کہ مخبر صادق نے یہ کب فرمایا کہ جو نام مسلمانوں کا کوئی گروہ رکھ لیگا۔ اور جماعت مسلمانوں کی قائم ہو جائے گی۔ وہی جماعت حق ہو گی۔ جس سے وابستہ ہونا نجات و فلاح کا ضامن ہو گا۔ جماعت کے قیام میں بنیادی امر تو اللہ کا دین ہے۔ جو جماعتیں اللہ کے دین کے قیام کے لئے اٹھیں۔ وہی قیادت امت کے میدان انتخاب میں اتر سکتی ہیں۔ آج جو جماعتیں میدان قیادت میں موجود ہیں۔ ان کو اس معیار پر پرکھ کر دیکھئے۔ اگر کوئی پوری اترے تو بہتر۔ لیکن اگر کوئی بھی پوری نہ اترے تو پھر اس معیار کو مقرر

کیجیے جو جماعت حق ہونے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا ہے۔ اور پھر اس کے مطابق جماعت قائم کیجیے، کوئی جماعت محض جماعت ہونے کے باعث شمولیت کی دعوت نہیں دے سکتی ؎

کس نیاید بزیر سایۂ بوم
ور ہما از جہاں شود معدوم

خفیہ فائل

شملہ کانفرنس کے زمانے میں اخباری حلقوں میں یہ افواہ گرم تھی۔ کہ اگر مرکزی حکومت کی تشکیل ہوگئی اور اس حرم سرائے ظلم و فساد میں کچھ ہندوستانی "غیر محرم" داخل ہو گئے۔ تو اس سے پہلے پہلے محکمہ داخلہ کی تمام خفیہ فائلیں تلف کر دی جائیں گی ـــــ اس پر دہلی کا ایک باخبر معاصر لکھتا ہے کہ یہ قدم ان غداران وطن کے اعمال ناموں کو بے نقاب ہونے سے بچانے کے لئے اٹھایا جاتا جو ہندوستانی ہونے کے باوجود دفتری برطانوی حکومت کے آلۂ کار تھے۔ چنانچہ جس زمانے میں صوبوں کے اندر قومی حکومتیں قائم ہوئی تھیں تو اسی قسم کا قدم اٹھانے کی اطلاعیں آئی تھیں۔

اس معاصر کی نگاہ صرف قومی اور وطنی غداروں کے نامہ ہائے اعمال کی طرف گئی۔ حالانکہ جس نظام حکومت کی پوری بنیاد عدل و انصاف کی بجائے قوت و اقتدار اور ظلم و جبر پہ قائم ہو۔ اس کا سارا کاروبار ہی ایسے

اعمالناموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جن کو دنیا کے سامنے پیش کرنے سے وہ نظام حکومت شرماتا ہے ـــــــ انسان گناہ پر کتنا ہی دلیر ہو مگر وہ دل ہی دل میں یہ ضرور محسوس کرتا ہے کہ میں گناہ کر رہا ہوں۔ انسان کی فطرت کا یہی راز ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے کراماً کاتبین کا انتظام فرما رکھا ہے۔ قیامت کے روز انسان چاہے گا کہ کاش اس کی خفیہ فائل تلف ہو جاتی۔ مگر وہ تو الم نشرح ہو کر رہے گی۔ یہی حال اس دنیا کا بھی ہے۔ یہاں بھی ظلم و استبداد کے خداوند اپنے نامۂ اعمال کو دنیا سے چھپانا چاہتے ہیں۔ لیکن کاش کہ وہ اخفائے اعمال کی بجائے اعمال ہی ایسے کرتے کہ ان کا اظہار ان کے اخفا سے بہتر ہوتا۔

ریڈیو کا وعظ

ایک ہمسایہ مکان سے ریڈیو کی تانیں اُڑ اُڑ کر دفتر کو تیر میں آ رہی ہیں کوئی بائی جی طبلہ و سارنگی کے ساتھ لہک لہک کر گا رہی ہیں ؎

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خودگری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا
تو ان کو سکھا خارا شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا

امت مرحومہ کے جوانوں کی سلامتی کی دعائیں کون مانگ رہا ہے۔ ایک بائی جی جو اپنی جوانی کی بہار سے خدا جانے کیا کیا کر چکی ہیں۔ ان کو خودشناسی وخودنگہری کا سبق دلوانے کے لئے کون بے تاب ہے۔ وہ رقاصہ ومغنیہ جس نے اپنی خودی کو فروخت کر دیا ہے۔ ان کی پریشاں نظری کا علاج کسے مطلوب ہے۔ جس کی حیا وعصمت کے دیدوں کا پانی ڈھلک چکا ہے۔ مغرب کی شیشہ گری سے ہٹا کر اسے خارا شگافی کا فن کون سکھانا چاہتی ہے۔ وہ لعبت حسن جو مغرب کی شیشہ گری کا بہترین نمونہ ہے ——— یہ ریڈیو والے کتنے ستم ظریف ہیں۔ اور غزل کس کی ہے اقبال مرحوم کی، شاعر اسلام کی، ترجمان حقیقت کی، حکیم امت کی ——— آہ ریڈیو والوں کی ستم ظریفی۔ فرمایئے اس غزلخوانی کی تاثیر کیا ہے۔ اس دعا والتجا کی قیمت کیا ہے۔ اور انجام کیا۔ لیکن ذرا تھوڑی دیر کے لئے توقف کیجئے۔ انصاف سے کام لیجئے۔ بائی جی کی غزلخوانی مہمل اور ریڈیو والوں کی ستم ظریفی پر مبنی۔ مگر اسلام کے درد میں ان لوگوں کا تڑپنا جو اسلام کی بجائے دین فرنگ کے رنگ میں رنگین ہیں۔ ملت کے عروج واقبال کے نعرے ان لوگوں کا لگانا جن کی زندگیاں باطل کی پیرو ہیں۔ کیا ریڈیو پر ان بائی جی کی اس غزل سرائی سے مختلف ہے؟ اس کی زبان پر بھی تو درد ملت کا ترانہ ہے اور نظر ریڈیو کے اس چیک پر جس کی کشش اس کو کھینچ کر یہاں لائی اور ایسی پاکیزہ غزل گانے

پر مجبور کر رہی ہے۔ اور ان لوگوں کی زبان پر بھی "ہائے اسلام" کی پکار ہے مگر جسم نظام باطل کی خدمت میں وقف تاکہ زندگی کی متاع حاصل ہو۔

رسمی اسلام

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک روز سورج گرہن تھا۔ نماز کسوف کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد و ثناء کے بعد فرمایا "اس جگہ ہر چیز میری نظروں کے سامنے ہے۔ یہاں تک کہ جنت بھی اور دوزخ بھی۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ تمہیں قبروں میں اسی طرح یا تقریباً اسی طرح آزمایا جائے گا جس طرح فتنۂ مسیح الدجال سے پوچھا جائے گا کہ اس شخص (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق تم کیا جانتے ہو، صاحب ایمان و یقین تو فوراً پکار اٹھے گا کہ یہ محمدؐ ہیں اللہ کے رسول۔ روشن نشانیاں اور ہدایت لیکر ہمارے پاس آئے ہیں۔ ہم نے ان کو قبول کیا اور ان کی اتباع اور پیروی کی۔ اس پر اس سے کہا جائے گا۔ سو جاؤ تمہارا شمار صالحین میں ہے۔ ہمیں تو پہلے ہی معلوم تھا کہ تم رسول اللہ پر یقین رکھتے ہو۔ لیکن منافق یا وہ شخص جو مرتاب اور شک میں مبتلا ہو گا (جس نے رسول اللہ کو یقین و ایمان کے ساتھ قبول نہیں کیا ہو گا) تو وہ جواب دے گا کہ مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں نے لوگوں کو سنا کہ کچھ کہتے ہیں پس میں بھی انہی کی سی کہتا رہا۔ بخاری داؤ کما قال)

نسلی اور رسمی مسلمانوں کے اسلام کا انکار مقصود نہیں۔ مگر وہ ملاحظہ فرمائیں کہ مرنے کے بعد اس رسمی "اقرارِ اسلام" کی قیمت کیا ہے۔ اُس وقت تو وہی نقش روح کی لوح پر قائم رہے گا جو اس میں کھدا ہوا ہوگا۔ اوپری نقش و نگار سب دھل جائیں گے۔

فلمی دنیا

ایک معاصر راوی ہے کہ ایک کالج کے انتخابی پرچے میں ۴۳ لڑکیوں کی ایک جماعت سے سوال کیا گیا کہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد تم کس قسم کی زندگی گزارنا پسند کروگی۔ اس پر

۳۷ لڑکیوں نے لکھا۔ ہم فلمی دنیا میں جائیں گی

۳ لڑکیوں نے جواب دیا۔ ہم معلمہ بنیں گی۔

۲ لڑکیوں نے بتایا۔ ہم ڈاکٹری پڑھیں گی۔

اور صرف ایک لڑکی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ میں کسی شریف نوجوان سے شادی کرکے گھریلو زندگی بسر کروں گی۔

جوابات کی یہ فہرست ہماری تمدنی، تعلیمی اور معاشرتی رفتار کی "مقیاس الحرارت" ہے یعنی ۸۰ فی صدی سے زیادہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے دل کی آرزو یہ ہے کہ وہ فلمی دنیا میں جائیں گی ——— لیکن یہ فلمی دنیا کیا ہے۔ اس سوال کا جواب ہندوستان کے نالی روڈ کی ایک

ایک اخبار سے سنیئے ــــ جب بولنے والی فلمیں کثرت سے بننے لگیں تو پہلے نوجوان مرد تعلیم و تدریس چھوڑ چھاڑ کر بمبئی کا رخ کرنے لگے اور اس کے بعد حسین و جمیل اور جوان لڑکیوں نے بھی باب الہند کا رخت سفر باندھا انہوں نے سوچا جب فلم دیکھنے میں اتنا لطف آتا ہے تو فلم میں کام کرنے کا حظ و نشاط کیا ہو گا۔

لیکن جب بی۔ اے اور میٹرک پاس خوش گلو اور خوش گل لڑکیاں بمبئی میں پہنچ جاتی ہیں تو ان کا جو انجام ہوتا ہے اس کے تصور ہی سے غیرت انسانی زمین میں گڑ جانا چاہتی ہے۔ یہ ساختہ پرداختہ لڑکیاں جو اپنے گھروں کی پرسکون اور بے کیف مگر مقدس فضا میں شاہزادیوں کی طرح رہتی تھیں۔ در در کی ٹھوکریں کھاتی ہیں۔ عصمت کے ڈاکو اور حسن کے لٹیرے۔ فلموں کے دلال۔ فلم پروڈیوسر اور ڈائرکٹر اور ان کے حواری ان کی نسوانی دولت پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ذلت و خواری کی عمیق گہرائیوں میں غوطے کھانے کے بعد مایوس و نامراد گھروں کو واپس لوٹ جاتی ہیں۔ اور چند "فلمی دنیا" میں چند سال کے لئے جگہ بنا لیتی ہیں۔ مگر کب؟ جب کہ وہ خود عبرت کا ایک الم انگیز اور شرمناک فسانہ بن چکی ہیں ــــ یہ ہے وہ فلمی دنیا جس میں جلوہ فرمانے کے لئے ۴۳ میں سے ۲۷ لڑکیاں تیار ہو رہی ہیں۔

جائداد

مسٹر چرچل نے شام و لبنان کے مسئلے پر فرانس کو اپنی خیر سگالی کا یقین دلاتے ہوئے فرمایا تھا۔ "زمین کے کسی حصے میں انگریزوں کا ارادہ نہیں کہ دوسرے لوگوں کی جائداد کو اڑالیں۔"

اس پر ایک مسلمان نوجوان ایک انگریزی اخبار میں لکھتا ہے کہ "جائداد" کا لفظ ان افکار و اصول کی پوری نشاندہی کرتا ہے جو مسٹر چرچل کے دماغ میں جاگزیں ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ مقبوضہ ممالک ان قوموں کی جائداد اور ملکیت ہیں۔ جہاں یہ حکومت کرتی ہیں ——— پھر کیا ہندوستان انگریزوں کی جائداد ہے؟

بلاشبہ! اور یہ اس لئے نہیں کہ انگریز اس ملک کو اپنی جائداد سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ خود ہندوستانی اپنے کو ایک جائداد تصور کرتے ہیں جس پر کسی طاقت بہر حال قابض ہونی چاہئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انگریزوں کے لئے ممکن نہیں تھا کہ وہ اس ملک پر قابض رہ سکیں۔ ہندوستانیوں نے روپے اور کثرت کے معاوضہ میں خود کو انگریزوں کے قبضہ میں دے رکھا ہے۔ یہ لاکھوں کی تعداد میں سرکاری ملازم جن کے سر پر نظام حکومت چل رہا ہے۔ یہ کروڑوں کی تعداد میں سرکاری ملازمتوں کے لئے آپس میں لڑنے والے ہندوستانی جن کے اختلافات کی وجہ سے غیر ملکی محکومی

ہندوستان پر مسلط ہے۔ آخر روٹی اور کپڑے کے عوض اپنا جسم، ضمیر اور روح انگریزوں کے ہاتھوں بیچنے والے نہیں تو کون ہیں۔ پھر ہمارے نوجوان مسلمان کو یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ کیا ہم انگریزوں کی جائداد ہیں؟

وادیٔ مصائب

"مصائب" کا لفظ کتنا ہولناک ہے، اور ان کا شکار ہونا کتنا روح فرسا مگر یہی وہ وادی ہے جس میں سے ہو کر کامیابی و کامرانی کی راہ گئی ہے جو ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ایک باغیانہ سی قرارداد منظور کی تھی۔ ابھی اس کی اطلاع اخباروں میں بھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ کہ اس کے مجوزہ و مؤید ایک ایک کر کے پونا اور احمد نگر میں قید کر دیئے گئے۔ ملک میں اس واقعے سے ایک ہیجان برپا ہو گیا مارپیٹ پکڑ دھکڑ، اکھاڑ پچھاڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جیل خانوں کے دروازے کھل گئے۔ مصائب کی آندھیاں ٹوٹ پڑیں۔ چند ماہ میں پورے ملک میں "امن و سکون" ہو گیا۔ دنیا نے یقین کر لیا کہ باغیانہ قرارداد منظور کرنے والے اب زندگی بھر کے لئے محبوس ہو گئے۔ اب وہ مر کر ہی قید خانہ سے نکلیں گے۔ ان کو رہا کرانے کے لئے سب ہی نے زور لگایا۔ مگر حکومت نے جواب دیا جب تک یہ لوگ قرارداد کو واپس نہ لے لیں ان کی رہائی کا تصور بھی نہ کرو۔

لیکن یکایک ایک روز قید خانوں کے دروازے کھل گئے۔ قرارداد اپنی جگہ پر موجود تھی، اور حکومت کا اعزاز بخیر موجود۔ اب انہی لوگوں کا نمائندہ والسرائے کے بائیں ہاتھ بیٹھا ہوا حکومت کی امیدواروں کا مرکز بنا ہے۔ اور جن وزیروں نے وزارتوں پر لات ماری تھی۔ ان کے لئے وزارتیں کب سے آغوش کھولے بے تاب ہیں ——— یہ ہے وادئ مصائب کے مسافروں کا انجام! اسی دوران میں ہم نے ایک دوسرا قافلہ بھی دیکھا۔ نوابوں، سروں اور خان بہادروں اور رائے بہادروں کا، انھوں نے خالی وزارتوں پر قبضہ جمالیا اور عیش کی بنسری بجانے میں مصروف ہو گئے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں یہ وفا ناآشنا محبوبہ ان کی آغوش سے نکل گئی۔ اور اب کوئی صورت نہیں کہ پھر قبضہ میں آئے ——— یہ ہے تن آسانی و عیش پسندی کے چمنستان کی سیر کرنے والوں کا مآل۔ اور قیام حق کی راہ کے مسافر اس سے عبرت اندوز ہو سکتے ہیں۔ ان کو یاد رکھنا چاہئیے کہ ان کی راہ اور بھی زیادہ صعب و دشوار ہے۔ مگر جتنی صعب و دشوار ہے اتنی ہی نتائج کے لحاظ سے خوشگوار ہے۔ کیونکہ ان کی حیات بھی حیات ہے اور موت بھی حیات۔

گندگی کا تالاب

گذشتہ دنوں ایک مسلمان گریجویٹ لڑکی کے متعلق اس اطلاع سے اخبارات میں خلفشار رونما ہو گیا تھا کہ وہ لاہور کے ایک محکمہ میں ملازم

ہے جہاں اسے فوجی ملازمت کے بعد تعینات کیا گیا ہے۔ مگر اس کے ہندو افسر اس کو تنگ کرتے ہیں اور اس کو اس عہدے سے ہٹا کر ہندو لڑکیوں کو اس کی جگہ دلوانا چاہتے ہیں۔ تنگ کرنے کی ایک صورت یہ تھی کہ اسے زیادہ کام پر مجبور کیا جانا۔ اور بعض اوقات رات سے اپنے مکان پر حاضر ہونے کا حکم دیا جانا وغیرہ وغیرہ

اس پر ایک معاصر لکھتا ہے کہ عورتوں کو ملازمت کرانے کے لئے تعلیم دلانا یورپ کی ایک لعنت ہے جو ہندوستان والوں نے تقلید فرنگ میں اختیار کر لی ہے اور وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ اس سے اجتناب کریں بجا ارشاد ہوا۔ مگر مسلمان مردوں کو بھی ملازمت کے لئے تعلیم دلانا کہاں کی دینداری ہے مسلمان مردوں کو اس ذریعۂ معاش کے باعث جن گندگیوں سے آلودہ ہونا پڑتا ہے وہ اس وجہ سے تو پاکیزگیاں نہیں بن جائیں کہ وہ مرد ہیں۔ یورپ کا پورا نظام زندگی جس کی خدمت میں آج مسلمان مصروف ہے گندگی کا نالاب ہے اس میں عورت غوطہ لگائے یا مرد، دونوں کا بدن، لباس اور روح گندہ ہوں گے۔ پھر عورتوں کو گندگی سے بچانا اور مردوں کو گندگی میں پھینکنا خدا جانے کس منطق کی رو سے درست ہے ؟

"مسلمان کی زندگی"

ایک مسلمان معاصر برما شیل کمپنی میں مسلمان ملازموں کی کمی کا رونا روتا ہوا لکھتا ہے کہ

"اس دردناک حالت کی وجہ یہ ہے کہ اوپر سے نیچے تک ہندو قابض ہیں اور وہ حتی الامکان کسی مسلمان کو پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتے اور جو بدنصیب کسی طرح نوکر ہو بھی جاتا ہے اس پر زندگی وبال کر دی جاتی ہے۔"

جو قوم زندگی سے محبت کرنے لگتی ہے۔ اور اپنا نصب العین بھول جاتی ہے اس کی زندگی ہمیشہ وبال رہتی ہے۔ جب زندگی نام ہی غلامی اور ملازمت کا ہو۔ تو اس میں مسرت کہاں سے آئے گی۔ غلامی اور وبال مترادف الفاظ ہیں۔ مسلمان کی زندگی تو حقیقت میں صرف یہ ہے۔ کہ وہ خدا کے دین کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اس راہ میں جو مصیبت آئے اسے ہنسی خوشی برداشت کرے مگر مسلمانوں نے تن آسانی کو حاصل حیات سمجھ لیا ہے۔ اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ شیطان کی خدمت کرتے ہوئے راحت و آرام سے وقت گزار لینا ہی کامیاب زندگی ہے۔ سرکاری ملازمت۔ اس کا گریڈ۔ اس کی ترقی بس یہی منتہائے اسلام ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ زندگی وبال ہو۔ حقیقت میں خود مسلمان زندگی پر وبال ہیں۔ وہ زندگی جو بندہ نواز حقیقی نے خدمت حق کے لئے عطا کی تھی۔

سادگی اپنوں کی دیکھ

لالہ لاجپت رائے آنجہانی نے ایک خط (بنام سی آر داس) میں یہ لکھا تھا کہ :-

"یہ مان کر بھی کہ مسلمان موجودہ عدم تعاون کی تحریک میں دل سے شریک ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا مذہب اس اتحاد کی راہ میں حائل ہوگا"۔ یعنی ہندو اور مسلمان انگریزوں کے خلاف متحد ہو جائیں مگر ہندوستان میں انگریزی اصول پر حکومت قائم کرنے کے لئے متحد و متفق نہیں ہو سکتے۔

یہ الفاظ لکھنے والے کے قلم سے قرآن اور مسلم قانون کا مطالعہ کرنے کے بعد نکلے ہیں۔ اور ہم اس غیر مسلم کی صاف دماغی اور نکتہ شناسی کے مدّاح ہیں کہ اس نے اسلام کو سرسری طور پر جاننے کے بعد ہی یہ معلوم کر لیا تھا کہ اس دین کے علمبرداروں کے لئے "انگریزی اصول حکمرانی" یا کسی "غیر اسلامی اصولِ حکومت" کا اختیار کر لینا ناممکن ہے۔

لے کاش "عزالدین" بھی اسلام کو اب تک اتنا ہی سمجھ گیا ہوتا جتنا "لاجپت" نے اسے سمجھا تھا۔ مگر اس کو تو خود اسلام ہی کی طرف سے انگریزی حکومت کی وفاداری و اطاعت کا پروانہ ملا ہوا ہے۔ اس کو خود قرآن "مغربی جمہوریت کا درس دیتا ہے۔ اسے فرمودات نبوی خود "سرمایہ داریت" سکھاتے ہیں۔ اور اسے سیر صحابہ "کمیونزم" کا درس دیتی ہے۔ اسے تاریخ اسلام سے "وطن پرستی" اور "نسل پرستی" اور "قوم پرستی" کی ہدایت ملتی ہے —— اور یہ سارے کفر اسلام بن جاتے ہیں۔

آگے چل کر وہ غیر مسلم لکھتا ہے کہ:۔ —— "میں مسلم لیڈروں پر اعتماد بھی کر سکتا ہوں۔ مگر قرآن و حدیث کے احکام کا کیا کیا جائے۔

یہ مسلمان لیڈر ان احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔

یہاں بھی وہ خوب سمجھا کہ "مسلمان" ہونے کے بعد قرآن و حدیث سے ایک انچ باہر ہو کر چلنا روا نہیں ہے، مگر مسلمان لیڈر اس سادہ نکتے کو بھی نہ پا سکے۔ اور ہر غول بیابانی کے ساتھ چل کر انہوں نے قرآن و حدیث کی پوری بساط الٹ دی۔

شاہ شطرنج

شاہ جاپان عام حکمرانوں کے مقابلے میں خداوندی سے کچھ زیادہ متوجہ رکھتے تھے یعنی آپ کا تعلق اپنے عوام سے حاکم و محکوم کا تعلق ہی نہیں تھا بلکہ علاوہ بریں ایک فداکارانہ عقیدت بھی بادشاہ کی چوکھٹ سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ اس عقیدت کو مشتعل رکھنے کے لئے بادشاہ عوام کی نگاہوں کی دسترس سے بالا بالا رہتا۔ اس کی آواز سننے کی سعادت کسی کان کو کم ہی نصیب ہوتی۔ اور وہ رعایا کو براہ راست کبھی مخاطب نہیں کرتا ——
لیکن اب جاپان کی شکست سے شاہ کی خدائی بہت خطرے میں پڑ گئی اس نے پہلی مرتبہ مجبور ہو کر شکست کا دردناک پیغام اپنی زبان سے سنایا۔ اس نے پہلی مرتبہ دوسروں کے ہاتھوں میں مہرہ بننے کی ذلت قبول کی، اس نے پہلی مرتبہ اپنی رعایا کو دوسروں کے تسلط میں دینے کا اقرار کیا —— اور ان حالات میں گویا شاہ نے اپنی مخلوقانہ بے بسی کا برسرِ عام اعلان کر دیا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اب جاپانیوں کی شاہ پرستی کے دن جئے گی۔ اور ہیرو ہیٹو کہاں تک ان عقیدتوں کا مرکز بنا رہے گا۔

آہ اے انسان! تیرے محبوب جابرہ، تیرے مقدس نمرود، تیرے محترم فراعنہ ـــــ سب کے سب بساط حیات پر شاطر تقدیر کے ہاتھوں میں حرکت کرنے والے ہیں۔ جب تک یہ اپنے وزیروں، اور فیلوں اور اسپوں اور شاہ رخوں کے بل پر دوسروں کے مہرے پیٹے چلے جاتے ہیں یہ اپنی اور دوسروں کی تقدیر کے معمار نظر آتے ہیں۔ مگر جس دن، دن پھرتے ہیں اور کوئی حریف ان "شاہ" نامدار کو زچ کر دیتا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ "شاہ" تو محض "شاہ شطرنج" تھے!! دراصل "شاہ" تو کوئی اور ہے۔

اسلام اور رواج

پنجاب کے ایک مشہور مسلمان اخبار کے مالک اور مدیر نے جو بفضلہ تعالیٰ مولانا ہیں۔ اور ایک "حضرت مولنا" کے فرزند ارجمند۔ عدالت انگریزی کے سامنے اپنے والد محترم اور رشتہ داروں کے خلاف استغاثہ پیش کیا۔ کہ ان حضرات نے جائداد کو شریعت اسلامی کے مطابق تقسیم کر کے انہیں ان کے اس حق زائد سے محروم کر دیا جو رواج کی پابندی کی صورت میں ان کو حاصل ہوتا۔ ایک اخبار کا بیان ہے کہ اس حق زائد کی مقدار ایک ٹکا فی روپیہ ہے۔

شریعت کے معنی اسلام ہیں اور رواج کے معنی کفر، مگر مسلمانوں کے ممتاز طبقوں کا بھی یہ حال ہے کہ وہ دنیوی مفاد کے لئے شریعت سے منہ موڑتے ہیں اور رواج کی طرف دوڑتے ہیں۔ خدا سے بغاوت کرتے ہیں خدا کے قانون کے خلاف مدد طلب کرتے ہیں۔ اور پھر یہ واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی پوری زندگی اسی نہج پر چل رہی ہے۔ اصول حیات اب یہ نہیں کہ خدا کے احکام کی اطاعت کرنی چاہیئے اور نفع ونقصان کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ بلکہ یہ ہے کہ اپنے خیال کے مطابق دنیوی منافع حاصل کرنے چاہئیں۔ اور خدا کے احکام کو پس پشت ڈالنا چاہیئے ــــــ بحث کفر و اسلام کی نہیں تکفیر و تفسیق کی نہیں لیکن اتنی بات ضرور توجہ طلب ہے کہ اس طرز عمل کی موجودگی میں اس قسم کے مسلمانوں کا اسلام کتنی قیمت رکھتا ہے اور اپنے حامل کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔

تبلیغ کا حق

معاصر ہمدم لکھنؤ "علماء کے فرائض" کے ماتحت علمائے اسلام کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ میدان عمل میں نکلیں۔ اور جس طرح علمائے سلف نے جمہور کو اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ اسی طرح یہ علمائے خلف کریں۔

"تبلیغ اسلام" کا غلغلہ نصف صدی سے ہم سنتے چلے آتے ہیں۔

اور تبلیغ اسلام کی انجمنیں اور جماعتیں بھی ہم نے کافی سے زیادہ دیکھی ہیں۔ لیکن آج تک یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ تبلیغ اسلام کرنے والے اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان پر تبلیغ کی جائے یا وہ جن کو یہ مبلغین اسلام تبلیغ کا نشانہ بناتے ہیں۔ آخر مبلغین اسلام کس پہلو سے ان لوگوں سے بہتر ہیں جن کو وہ اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ عقائد میں، اعمال میں، ایمان میں عادات و اطوار میں —— اور جب نہیں (الا ماشاء اللہ) تو مبلغین کو تبلیغ کا حق کس نے دیا۔

یہ مبلغین اسلام جب صداقت اسلام کے دلائل دیتے ہیں تو آخر میں کہتے ہیں "لوگو ہمیں نہ دیکھو اسلام کو دیکھو"۔ سوال یہ ہے کہ پھر آپ اسلام کا علم لیکر کیوں گھر سے نکلے ہیں۔ ضرورت حقیقت میں یہ ہے کہ علمائے اسلام کو پہلے اسلام کی تبلیغ کی جائے۔ اس کے بعد ان کو اجازت دی جائے۔ کہ وہ دوسروں کے سامنے اسلام کو پیش کریں۔

ترقی معکوس

آج سے ساٹھ برس پیشتر سر سید مرحوم پنجاب تشریف لائے علی گڑھ کالج کے قیام کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں نے چندے میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیا۔ سر سید نے پنجاب کے کونے کونے میں زندگی، حرارت ایثار اور قربانی دیکھی —— اور "زندہ دلان پنجاب" کا قابل فخر خطاب دیا۔

ساٹھ برس کے بعد مسٹر جناح پنجاب آ گئے۔ ۴ دن لاہور میں قیام کیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ پنجاب کی وزارت جس کے مسلمان ارکان قائد اعظم کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ اتحاد پارٹی کا لیبل اتار کر مسلم لیگ کا لیبل لگا لے۔ بوتل پر صرف شہد کا لیبل لگا دیا جائے۔ اس کی ضرورت نہیں کہ اندر کی شراب بھی بدلی جائے۔ لیکن چند روز کی تگ و دو، گفت و شنید، ملاقات، مشورہ اور بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر جناح نے پنجاب کے سب سے بڑے تعلیمی دار دار اسلامیہ کالج لاہور کے طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا پنجاب کے مسلمانوں میں سب کچھ ہے مگر کیریکٹر نہیں۔

ستر برس کی تعلیمی، سیاسی اور قومی جد و جہد کے بعد یہ ہے قوم کی ترقی ___ ترقیٔ معکوس۔ ستر برس پہلے پنجاب کے لوگ زندہ دل تھے۔ سر سید نے ان کے سامنے تعلیم کا اور مسلمان جماعتوں نے قومی احساس کا پروگرام رکھا۔ مسلمانوں نے اس پر عمل کیا۔ اور پروگرام دینے والوں نے پرکھا۔ تو کہا مردہ دل!!

بوالعجبی

ہندوستان میں مسلمان جنگجو اور فاتح کی حیثیت میں آئے۔ انہوں نے حکومت کا پیشہ اختیار کیا۔ اسی کا ایک حصہ ملازمت تھی۔ اس لئے حکومت اور ملازمت کو عزت کا سرمایہ تصور کیا جانے لگا۔ زمینداری اور زراعت بھی حکومت ہی کا ایک شعبہ ہے۔ مگر تجارت کو انہوں نے ناپسند کیا۔ تاجر اور

صنّاع کو لوگ ذلّت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اور یہ ذہنی گمراہی اس وقت بھی قائم رہی جب وہ حکومت سے محروم ہو کر دوسروں کے محکوم ہوگئے سرکار کی ملازمت موجب اعزاز اور تجارت و صنعت باعث ذلت ہی رہی۔

زمانہ نے کروٹ بدل لی۔ تجارت نے حکومت و فرمانروائی پر قبضہ کر لیا۔ تاجر حکومتوں کے مالک اور آقا بن گئے۔ مگر مسلمانان ہند کے ذہن میں انقلاب نہ آیا۔ ان کے نزدیک ایک آزاد تاجر، سرکاری ملازم سے گھٹیا ہی رہا۔ حالانکہ کم از کم اسلام نے تجارت و حرفت کو کمتر نہیں بلکہ بلند تر مرتبہ دیا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایماندار تاجر کو اپنا رفیق جنت اور صناع کو خدا کا دوست قرار دیا۔ مگر سرکاری ملازم کی کوئی تحسین نہ کی، بلکہ قرآن مجید میں عبد مملوک کو ناکارہ قرار دیا گیا۔

حیرت ہے کہ کسی تاجر سے کسی چیز کے خریدنے میں تو ذلت محسوس نہ کی گئی۔ مگر اس کا فروخت کرنا موجب ذلت سمجھ لیا گیا۔ کپڑا خریدنے میں کوئی حرج محسوس نہ ہوا۔ مگر بنانا اور بیچنا موجب عار ہو گیا ——— کوئی ہے جو اس بوالعجبی پر تعجب کرے۔

حضور پر نور

ایک مقامی مسلمان معاصر نے پنجاب کی ایک ریاست کی ترقیات پر

ایک شذرہ لکھا ہے۔ اس میں قدرتی طور پر والی ریاست کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ لہذا ہر مقام پر معاصر کے محترم مدیر نے ان کو "اعلیٰ حضرت حضور پرنور" اور "حضور پرنور" کے القاب سے یاد کیا ہے۔

الفاظ کا یہ کتنا غلط استعمال ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ والیٔ ریاست اقتدار اور تمول کا مالک ہے۔ اس کی خوشنودیٔ مزاج سے مال و دولت کے حصول کی توقع بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ جب تک مالک حق کی اجازت نہ ملے اس وقت تک کوئی خداوند باطل ایک حبہ بھی کسی شخص کو نہیں دے سکتا۔ لیکن خوشنودیٔ مزاج کے لئے یہ کہاں ضروری ہے کہ انسان تخاطب اور القاب کے لئے وہ الفاظ استعمال کرے جو حقیقت سے دور ہوں۔ والیٔ ریاست نواب اور راجہ ہو سکتا ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ "پرنور" کیسے ہو گیا۔ اس لئے کہ "نور" کا تعلق دل کی روشنی سے ہے، روح کی پاکیزگی سے ہے، اور خود مدیر محترم کو بھی معلوم ہے کہ ہمارے موجودہ والیان میں سے ایک کا دل اور روح بھی نورانی نہیں۔

پھر اس قسم کے القاب کا مطلب خود لکھنے والے کی دماغی تاریکی اور اخلاقی پستی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ——

—— حیرت ہے۔ کہ زمانہ کہیں سے کہیں نکل گیا۔ مگر مسلمان اہل قلم کی شاہ پرستی نہ گئی۔

نمونۂ تقلید

لاہور میں مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس میں خطبۂ صدارت ارشاد کرتے ہوئے مسٹر حسین امام نے پنجاب کے مسلمان وزراء اور ہندو وزراء کا موازنہ کیا۔ اور کہا کہ ہر مسلمان وزیر کا فرض ہے کہ وہ سر چھوٹو رام بننے کی کوشش کرے۔

جب کوئی قوم اپنے صحیح مقام سے گر جاتی ہے تو اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ وہ ہر چمکتی ہوئی شے کو سونا سمجھتی اور اس کی طرف دست طلب بڑھاتی ہے۔ سر چھوٹو رام نے انگریزی نظام حکومت میں اپنی قوم کو فائدہ پہنچانے کی کتنی ہی کوشش کی ہو مگر وہ ایک مسلمان وزیر کے لئے "اسوہ حسنہ" پیش نہیں کر سکتے۔ ایک مسلمان کے لئے طلب و آرزو کا معیار "الذین انعمت علیہم" ہے۔ اور انہی کی روش پر چلنے کی تمنا اور دعا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ گاندھی جیسا غیر مسلم تو اپنے وزیروں کو فاروق اعظم صدیق رضی اللہ عنہما کی پیروی کرنے کی ہدایت کرے اور مسلمانوں کا رہنما سر چھوٹو رام کی

ایک کہانی

"ایک جگہ دو بھائی رہتے تھے۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ وہ دونوں ایک

دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ایک مشرق کو چلدیا دوسرا مغرب کو۔ دونوں ایک دوسرے کو بالکل فراموش کر بیٹھے۔ صرف ایک بات دونوں کو یاد رہ گئی۔ اور وہ یہ تھی کہ وہ اپنی بنسریوں پر ایک ہی طرح کے چند گیت گاتے تھے۔ بس یہی شے ان میں مشترک تھی۔ ان دو بھائیوں پر کئی صدیاں گزر گئیں۔ آخر کار ان کی اولادوں نے بنسری کے ان مشترک نغموں کی بنا پر ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اور وہ پھر باہم گلے مل گئے۔"

یہ کہانی ایرانی ثقافتی مشن کے لیڈر علی اصغر حکمت نے الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر امر ناتھ جھا کی تقریر کے جواب میں سنائی۔ آغا حکمت نے کہا بالکل اسی طرح ایرانی اور ہندوستانی قومیں ایک ہی مورث اعلیٰ کی اولاد ہیں۔ اور ہم بھی اپنی بنسریوں کے نغموں کو گانے کے لئے ہندوستان آئے ہیں تاکہ ہندوستانی ان نغموں سے متاثر ہوں اور ہم دونوں قومیں پھر رشتۂ اتحاد میں جکڑ جائیں۔

ایرانی کہانی انسانی فطرت کے لازوال اصولوں پر مبنی ہے۔ ذہن کے منتشر ساز جب ایک ہی لے بلند کرتے ہیں تو دل اور جسم مل جاتے ہیں۔ لیکن کیا یہی وہ نغمہ نہیں جو اس حقیقت میں پیش کیا گیا ہے کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اگر بنسری کے چند نغمے بچھڑے ہوؤں کو ملا سکتے ہیں تو انسانی فطرت کی وحدت کے پورے ساز کے نغموں کی یکسانی کیوں کائنات انسانی کو متحد نہیں کر سکتی، اور نسل و رنگ کے

امتیازات کو کیوں نہیں مٹا سکتی۔

ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کی صحت و غلطی سے قطع نظر، اس کا یہ نتیجہ کتنا ہولناک ہے کہ اس سے انسان کے مورثِ اعلیٰ الگ الگ ہو جاتے ہیں، اور وحدتِ انسانی کا وہ مبارک نظریہ جس پر امنِ عالم کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔ سچ ہے خدا نے انسان کو پیدا کیا اور شیطان نے قوم کو۔

کج دار و مریز

مولانا سید فخر الحسن صاحب پروفیسر اورینٹل کالج فتحپوری دہلی نہایت سنجیدہ بلکہ رنجیدہ سامنہ بنا کر تحریر فرماتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی نے اپنے علوم مشرقی کے امتحانات کے سلسلے میں حکم دیا ہے کہ مولوی، مولوی عالم اور مولوی فاضل کے امیدوار فارم داخلہ کے ساتھ اپنے فوٹو کی تین تین کاپیاں بھی ارسال کریں، مولانا اس عجیب و غریب بلکہ اندھیر کے خلاف تین اعتبارات سے احتجاج کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) ان کلاسوں میں بالعموم مذہبی خیال کے نوجوان حصہ لیا کرتے ہیں اور فوٹو مذہبی اعتبار سے ممنوع ہے۔

(۲) آج کل گرانی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ پہلے جو فوٹو مہ رمیں تیار ہوتا تھا وہ اب ایک روپے میں بنے گا۔

(۳) علومِ مشرقی کے امتحانات میں کبھی ایسی شرارت نہیں ہوئی کہ اس احتیاط کی ضرورت ہو۔

جہاں تک اس حکم کا تعلق ہے پورے زور کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نامعقول ہے۔ لیکن مدیر "تیر و نشتر" کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی، کہ مذہبی قسم کے اور وہ بیزار طلباء کو پنجاب یونیورسٹی پسند ہی کب کرتی ہے کہ ان کے مذہبی اور معاشی احساسات اور ضرورتوں کا لحاظ رکھے، انگریزی تعلیم کے پورے نظام میں اس کج دار و مریز مذہبیت کے لئے گنجائش ہی کہاں ہے۔ اور اس کا مقصد ہی یہ کب ہے کہ کسی کا ایمان بھی سلامت رہے موجودہ نظامِ حیات تو انسان کی روح تک کو خرید لینا چاہتا ہے۔ اس کے بعد زندہ رہنے یا معاش حاصل کرنے کا حق دیتا ہے۔ علومِ مشرقی اور علومِ مغربی کا شوق اور ایمان و اسلام کی حفاظت کا خیال یعنی گندگی کے تالاب میں چھلانگ لگانا اور پھر اس کا بھی خیال رکھنا کہ دامنِ تقدس آلودہ نہ ہو؟

قصرِ اسلام کے معمار

آل انڈیا خواتین کا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس میں مس خدیجہ منہاس نے ایک قرارداد پیش کی جس کا مفاد یہ تھا کہ بیگم رشیدہ لطیف نے پنجاب اسمبلی میں جو مسودہ قانون شریعت پیش کر رکھا ہے کانفرنس

اس کی تائید کرتی ہے۔ کانفرنس کی صدر مسز کمیتی کملا دیوی چٹوپادھیا تھیں تمام حاضرات نے اس قرارداد کی تائید کی۔

ہم اس "مارون گھٹنا پھوٹے آنکھ" پر حیران ہیں کہ مسودۂ قانون تو پیش کیا گیا پنجاب میں اور اس کی تائید کی صدا بلند کی جاتی ہے بمبئی سے! معاملہ زیر غور ہے اس اسمبلی کے سامنے جس کی اکثریت مسلمان ارکان پر مشتمل ہے۔ اور مسئلہ اس وزارت کے اختیار میں ہے جس کا رئیس الوزراء مسلمان ہے۔ مگر تائید حاصل کی جاتی ہے اس کانفرنس سے جس کی اکثریت بالعموم غیر مسلم ہے۔ یہ کیا بوالعجبی ہے۔ کیا مسودۂ قانون شریعت کبھی ایسی شے ہے جس کے لئے انسانوں کی اور پھر غیر مسلموں کی تائید کی ضرورت لاحق ہو۔

آہ اے اسلام کے قانون مظلوم! تیری تائید غیر مسلم خواتین کرتی ہیں اور تیری مخالفت مسلمان مرد! اور پھر انہیں دعوے ہے کہ اسلام کی سربلندی کی عمارت انہی کے ہاتھوں سے تعمیر ہوگی۔

زمانے کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے مکانات کی تعمیر میں ماہر فن معماروں اور محنتی مزدوروں کو استعمال کرتے ہیں۔ مگر اسلام کی عمارت کے ورثاء اسلام کی تعمیر کا کام منہدم کرنے والوں سے لینا چاہتے ہیں ——— اور پھر منتظر ہیں کہ عمارت کب بلند ہوتی ہے۔

آزادی کے پھندے

دنیا کے گوشے گوشے میں آزادی کی خواہش کروٹیں لے رہی ہے مشرق کے اس کنارے سے مغرب کے اس کنارے تک زمین کا ہر ذرہ اس خواہش کے زیر اثر تڑپ رہا ہے۔ اور ہر سینے کے اندر دل اس کی اکساہٹ سے تیز تیز دھڑک رہا ہے۔

مگر ہائے افسوس لفظ آزادی کو جو معنی دنیا نے عمل میں پہنائے جاتے ہیں ان کا قفس انسان کا گلا گھونٹ دیتا ہے شہنشاہیت جاتی ہے تو جمہوریت کی نقاب اوڑھ کر شیاطین خدائی جا لیتے ہیں، پھر جب یہ خدائی ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تو یک جماعتی مادی ریاست عوام کی گردنوں میں اپنا تنگ حلقہ ڈال لیتی ہے۔ یہ آزادی کے پھندے ہیں اور انہی کا نام آزادی ہے جس کے لئے خون کے دریا بہا جاتے ہیں۔

جب تک ریاست اور ارباب ریاست کے اوپر کوئی اقتدار نہیں ہے۔ عوام کے لئے حقیقی اور فطری اور خالص اور مکمل آزادی کا کوئی امکان نہیں! سن لو اے آزادی پسندو! اور خوب سمجھ لو [illegible]

دوا اور دعا

اگر کوئی آدمی بیمار ہو اور اس کے اعزہ و اقربا اس کو جان بوجھ کر ایسی

دوا دیں جس کے متعلق ان کو یقین ہو کہ وہ مفید ہونے کی بجائے مضر، مریض کے مزاج کے مطابق ہونے کی جگہ اس کے خلاف ہے۔ اور صحت بخشنے کی بجائے اسی قسم کے دوسرے مریضوں کو نقصان پہنچانے کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اور پھر وہ ہاتھ اٹھا کر خشوع خضوع کے ساتھ دعائیں کریں۔ کہ اے پروردگار! اپنے فضل و کرم سے اس مریض کو شفا دے۔ تو بڑا رحیم ہے۔ تو شافی مطلق ہے۔ تو قادر و توانا ہے۔ علیٰ کل شیئٍ قدیر ہے۔ اے خدا ہماری دعا قبول فرما۔ ہمارے اس مریض کو صحت عطا فرما۔ کیونکہ یہ ہمیں نہایت محبوب ہے

—— تو کیا خیال ہے آپ کا کہ اس شخص کو شفا ہو گی یا اس کی ہلاکت، یہ دعائیں قبول ہوں گی یا نامقبول، اللہ کی قدرت کاملہ رحم فرمائے گی یا غضب —— آپ کا جواب جو ہو گا وہ ہمیں معلوم ہے۔ آپ فرمائیں گے یہ لوگ احمق ہیں عقل کے دشمن ہیں۔ خدا کی صفات سے بے خبر ہیں قانون الٰہی سے ناواقف ہیں۔ خدا کا طریق کار یہ ہے کہ جب کوئی شخص خدا کے قانون کے مطابق عمل کرتا ہے، اور صحیح راہ اختیار کر کے جد و جہد کرتا ہے تو اس کی دعا بھی قبول ہوتی ہے۔ اور اس کی دوا بھی مفید ہوتی ہے۔ مگر ہندوستان میں ایک دو نہیں لاکھوں اور کروڑوں مسلمان موجود ہیں جو تسلیم کرتے ہیں کہ پیروان اسلام جن مقاصد کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں وہ اسلامی نہیں۔ جو طریق کار انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ اسلامی نہیں۔ اپنے سفر کے لئے جو ذرائع وہ استعمال کر رہے ہیں وہ اسلامی

نہیں ــــــ پھر بھی مسلمانوں کی آرزو ہے۔ نہایت عاجزی اور الحاح کے ساتھ دعا ہے۔ خدا کی رحمتوں کا واسطہ دیکر، رسول خدا کی امت میں ہونے کا دعویٰ کرکے اور اسلام کی محبت میں ڈوب کر دعا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سربلند فرمائے۔ ان کو دنیا کی کامیابیاں بھی عطا فرمائے ــــــ پھر کیا خیال ہے اس قسم کی دعاؤں، اس قسم کی کوششوں اور اس قسم کی آرزوؤں کا انجام کیا ہے۔ کامیابی یا ناکامی، اور آپ کو ان لوگوں کی عقل پر حیرت ہوتی ہے۔ یا نہیں۔ اگر ہوتی ہے تو غور فرماکر فیصلہ کیجئے۔ کہ آپ کا شمار بھی انہی عقلمند لوگوں میں ہے یا نہیں ــــــ بینوا۔ توجروا

توحید کی وسعتیں

گزشتہ دنوں ناگپور کے ایک کانگرسی کارکن سلیمان خاں پٹھان نے امراؤتی کے ایک مندر میں گنیش جی کا بت نصب کیا اور ساتھ ہی ایسا تقریر کی جس میں ہندو مسلم اتحاد کو آزادی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ بیان فرمایا۔

اللہ اکبر! غور فرمائیے انقلاب زمانہ کیا رنگ لایا ہے۔ اولاد خلیل نے آزری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ سیاست کے پردے میں بت پرستی جائز ہو گئی۔ وہ فرزندان توحید جو صدائے حق کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچانے والے، بحر و بر کی سختیاں جھیل کر شمع وحدانیت سے تاریکی

عالم کو منور کرنے والے۔ راہ حق میں اپنا خون پانی کی طرح بہانے والے۔ دو مذہب فطرت کے علمبردار۔ توحید کے پرستار جنہوں نے ملت اسلامیہ کے قصر عالیشان کو اپنی ہڈیوں سے تعمیر کیا۔ اب خود اسے منہدم کرنے کے درپے ہیں۔ بلاشبہ یہ واقعہ توحید کی دستوں" کا ایک تازہ نمونہ ہے۔ شرک اس وقت ہوتا ہے جب ایک غیرمسلم گنیش جی کی مورتی کو نصب کرے۔ کرشن جی کی تصویر کو سلام کرے۔ اور بتوں کو مندروں میں قائم کرے۔ مگر ایک مسلمان نے جب زبان سے "لا الہ الا اللہ" اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں کہہ لیا۔ تو پھر اس کی توحید پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر وہ یہ تمام حرکتیں کرلے۔ سوبھاش بوس کی تصویر کو سلامی دے۔ مسٹر جناح کی تصویر پر پھول چڑھائے۔ گنیش جی کی مورتی کو مندر میں نصب کرے۔ خدا کو بھی زندگی کا قانون دینے والا تسلیم کرے۔ اور برطانوی پارلیمنٹ کے حق قانون سازی کو بھی تسلیم کرے۔ بلکہ خود بھی اس منصب پر جلوہ گر ہو جائے۔ جس پر اس نے خدا کو قائم سمجھ رکھا ہے۔ اسلامی توحید کو ہندو کا دھرم تو نہیں کہ چھوئی موئی کی طرح ذرا کسی نے چھوا اور وہ مرجھا کر رہ گیا :۔

مسلماں پر سب کشادہ ہیں راہیں　　پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

اعمال نامہ

نئی دہلی کی اطلاع ہے کہ کانگرسی ممبر جب اقتدار کے تخت پر جلوہ گر

ہوئے تو ان کا جی چاہا کہ ذرا اپنے اس نامۂ اعمال کا مطالعہ تو کریں جسے انگریزی حکومت کے "کراماً کاتبین" ——— خفیہ پولیس ——— نے مرتب کیا تھا۔

کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

ذرا دیکھیں تو سہی کہ خداوندانِ حکومت کی رائے ہمارے متعلق کیا ہے۔ مگر انہیں یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ وہ مجی اور خفیہ فائل ہی غائب ہیں جن میں ان کا اعمال نامہ درج تھا۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ انہیں تلف کر دیا گیا ہے۔ اور کانگریسیوں کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ہی ان کے نامۂ اعمال کو محو کر دیا گیا ہے۔

ایک خداوندانِ باطل کے مرتب کئے ہوئے اعمال نامے ہیں۔ جو وہ اپنے سرکش "بندوں" کے متعلق مرتب کرتے ہیں۔ مگر جونہی دیکھتے ہیں کہ یہ "بندے" اب انہی جیسے "خداوند" بننے لگے ہیں تو انہیں تلف کر دیتے ہیں۔ گویا یہ ان کی اپنی فہرستِ جرائم ہے۔ مگر ایک وہ خداوند ہے جو قیامت کے روز ہر بندۂ سرکش کے ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ دے کر کہے گا۔ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا اپنی کتابِ حیات پڑھ لے اور آج خود اپنے اعمال کا جائزہ لے لے۔ اور بدنصیب انسان کہے گا۔ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ کاش! یہ اعمال نامہ میرے سامنے پیش نہ کیا جاتا ——— پھر بھی کتنے ہیں جو اس روز سے ڈرتے ہیں۔

سنت رسولؐ کی پیروی

اسلام کی پابندی اور سنت رسولؐ کی پیروی اب ایک عام پسند نعرہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہ خوبصورت الفاظ ان لوگوں کی زبان پر بھی رقص کرتے ہیں جن کی پوری زندگی غیر اسلامی نظام حیات کی پیروی کرنے میں گزر رہی ہے لیکن چونکہ مسلمان عوام اسی عوام فریب نعرے سے بے وقوف بنائے جا سکتے ہیں۔ اس لئے اس کا استعمال فراخدلی سے کیا جا رہا ہے۔ کرنال میں تقریر کرتے ہوئے آنریبل میجر شوکت حیات ...... فرماتے ہیں۔ کہ مسلمانوں کو اسلام کے احکام کی پابندی اور رسول کی سنت کی پیروی اختیار کرنی چاہیئے۔ لیکن اسی تقریر کے ابتدائی حصے میں وہ پاکستان کے حق میں دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ مسلمان اقلیت میں ہیں لہذا ان کو ہندو اکثریت سے اندیشہ ہے۔

پاکستان کے حسن و قبح سے قطع نظر قلت و کثرت کو خوف و اطمینان کا موجب قرار دینا سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ اسلام اور سنت رسول کی کونسی شق کے ماتحت درست ہے۔ جن کا فیصلہ یہ ہے کہ فتح و نصرت غلبہ و تسلط کثرت تعداد پر منحصر نہیں۔ کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله اللہ کا حکم ہو تو قلت کثرت پر غالب آجایا کرتی ہے۔ ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین نہ سست ہو جاؤ اور نہ غم کھاؤ۔ تمہیں غالب رہو گے۔ بشرطیکہ تم مومن ہو

ایک طرف احکام اسلام کی پیروی اور اتباع سنت کی ترغیب دینا اور دوسری طرف قلت و کثرت کا جھمیلا لے بیٹھنا ؎
بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

سہولت پسندی کا "مگر"

بعض نیک دل مسلمانوں کا عجیب حال ہے۔ جب ان کے سامنے تحریک اسلامی کو پیش کیا جاتا ہے۔ اور اس کے نصب العین اور طریق کار کی وضاحت کی جاتی ہے تو اس تحت الشعور جذبۂ اسلامی کی بنا پر جو اسلام دین حق اور اس کی اقامت کے متعلق قدرتی طور پر ہر مسلمان کے دل میں موجزن رہتا ہے۔ خواہ وہ پابند اسلام ہو یا نافرمان اسلام، ارشاد ہوتا ہے کہ بات تو یہی حق معلوم ہوتی ہے مگر ——— اور یہ "مگر" صاحب اپنا بہت لمبا اور خوفناک جبڑا کھول کر اور نہایت سنجیدہ صورت بنا کر حق کو نگلنے کے لئے لپکتے ہیں ——— مگر اس غلبۂ باطل کے باعث اقامتِ حق کا کام کرنا مشکل ہے!

بجا ارشاد ہوا۔ یعنی باطل کا غلبہ دور ہو جائے تو ہم حق پر عمل کریں گے۔ کیونکہ اس وقت حق پر عمل کرنا آسان ہو گا۔ تو مطلب یہ ہے کہ مقصد آسانی سے ہے۔ حق پر عمل کرنے سے نہیں ہے۔ مطلوب سہولت ہے۔ خدا کی پرستش نہیں ——— بہتر ہے ذرا اس آسان پسندی کے فلسفے پر ذرا

قائم رہے گا۔ اور ہندوستان کو آزاد کرانے کی جدوجہد اس وقت کیجئے گا۔ جب انگریز اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اور اگر آپ پاکستان کے حامی ہیں تو پاکستان بنانے کی جدوجہد اس وقت کیجئے گا جب جواہر لال خود ہی رحم کھا کر پاکستان بنا دے گا ـــــــ لیکن نہیں آپ کہیں گے آزادی اور پاکستان جدوجہد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے ـــــــ اچھا اگر یہی بات ہے تو کیا صرف نظام حق ہی ایسی شے ہے جس کے لئے سہولت پسندی کا "مگر" حرکت میں آتا ہے۔ مالکم کیف تحکمون۔

یا اپناں کمن یا اپنیں

جب مرکز میں "قومی حکومت" قائم ہوئی۔ تو دہلی کی ایک اطلاع تھی۔ کہ "سول سروس" کے انگریز ملازموں کو واپس برطانیہ جانے کی فکر ہوئی۔ چنانچہ حکومت ہند نے بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کیا۔ کہ جو لوگ واپس انگلستان تشریف لے جانا چاہیں گے۔ ان کے لئے ۱۹۴۷ء کے شروع ہی میں ٹکٹ مہیا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ایسے اصحاب "سفر کنٹرولر" کو اطلاع دیں کہ وہ کس ماہ میں سفر کرنا چاہتے ہیں۔

اس واقعے میں ایک قابل غور حقیقت پنہاں ہے۔ ہندوستان میں اس وقت جو سیاسی حالات نمودار ہو رہے ہیں۔ وہ اس نظام سیاسی

سے بالکل الگ ہیں جس میں تربیت پاکر انگریزسول سروس والے ہندوستان آئے تھے یعنی ایک نظام زندگی کا پیرو دوسرے نظام زندگی کی مشین میں پرزے کے طور پر کام نہیں کر سکتا ——— یہ ایک فطری حقیقت ہے جس کو پیروان کفر و باطل بھی سمجھتے ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ جب یہی بات پیروان حق کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو وہ نفع و نقصان کی میزان لگانے لگتے ہیں۔ حالانکہ جو کام اصولاً درست نہ ہو اس میں نفع و نقصان کی میزان کا سوال ہی کیا ہے جس طرح ایک انگریز سول سرونٹ ہندوستانی قومی حکومت کا پرزہ بن کر برطانوی اقتدار کے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح نظام حق کی پیروی کا ایک مدعی خدمت باطل میں مصروف رہ کر نظام حق کو سربلند نہیں کر سکتا ——— یا چناں کن یا چنیں!

انا ربکم الاعلیٰ

"رزاقی و قہاری" یہ دو اللہ ہی کی صفات ہیں لیکن جب پیروان شیطان اللہ کے تخت جلال پر قبضہ کرنے کی کوشش میں انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ مار کر زر دیدہ بس انسانوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ تو ان کی سب سے پہلی توجہ قہاری و رزاقی کی صفات کا مظاہرہ کرنے پر مبذول ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان کا نعرۂ ربوبیت باا ثر نہیں ہو سکتی۔

یورپ کی قومیں خدا کے بندے کو خدا بنا لینے کے بعد اب خود خدا

بننے کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ خدا کی دی ہوئی قوتوں کے ذریعے بندگان خدا کو مجبور و مقہور بنا کر وہ اپنی صفت قہاری کا ثبوت پیش کر چکی ہیں، اور اب رزاقی کا ثبوت دینے کے لئے مسئلہ معیشت کو اپنی تدابیر سے حل کرنے کی کوشش میں ہیں، پہلے انہوں نے سرمایہ داری کارخانے مشین اور بنک کے ذریعے بھوک کا سوال حل کرنا چاہا۔ لیکن اس سے انسان کی بھوک اور زیادہ ہوئی۔ پھر اشتراکیت کا تجربہ آزمایا گیا۔ لیکن وہ بھی اس دوزخ کو نہ بھر سکا۔ جس کو پیٹ کہتے ہیں۔ اور اب امریکہ اس میدان میں آیا ہے۔ اور اس کے سیاستدان اعلان کر رہے ہیں کہ جنگ کے بعد وہ بھوک کے دیو کو جکڑ کر رکھ دیں گے۔

لیکن صاف نظر آرہا ہے کہ مدعیان الوہیت اب بھی ناکام رہیں گے پیٹ کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ اس کی معیشت کا سامان بھی اس نے زمین میں رکھا ہے۔ اور جب تک اس کے بتائے ہوئے قاعدے کے مطابق ہی اس سامان کا انتظام اور تقسیم نہیں ہوگی۔ اس وقت تک پیٹ کا دوزخ ہل من مزید کا نعرہ لگاتا رہے گا۔

رسول کا واسطہ

معاصر حریت دہلی نے صوبہ سرحد کے گزشتہ ضمنی انتخابات پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا۔ کہ ہماری دلی دعا ہے کہ خداوند قدوس سرحد کے

کانگریسی مسلمانوں کو فتح دے اور مسلم لیگ کو شکست ہو۔ آمین بجاہ سید المرسلین! ہمیں لیگ و کانگرس کی فتح و شکست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن ہمارے کی اس دعا پر ضرور حیرت ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے انتخابات کی مہم سے بھی اللہ تعالیٰ کو خصوصی دلچسپی ہے۔ حالانکہ یہ انتخابات، اس نظام حکومت کا ایک اہم جزو ہیں جو سراسر شیطانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مصروفیات کے متعلق یہ بھی ایک دلچسپ تصور ہے۔ اور حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ تو اتنی پر لطف شے ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے چور چوری کرنے نکلے اور نماز دوگانہ ادا کر کے کہے۔ یا اللہ تیرے بھروسہ پر گھر سے نکلتا ہوں۔ اپنے حبیب کا واسطہ مجھے شاد کام و بامراد اور چوری کے مال سے لاد کر واپس لائیو۔ اگر اللہ کی امداد مطلوب ہے تو کام بھی اللہ ہی کا ہونا چاہیئے۔ شیطان کے کاموں کے لئے اللہ تعالیٰ کی نصرت کی طلب ــــــ این چہ بوالعجبی است!

ایک بہت بڑی بھول

دوران جنگ کا ایک سرکاری اعلان مظہر ہے کہ برما کی مہم میں کمانڈر ونگیٹ کی ہندوستانی فوجوں نے حیرت انگیز حالات میں کام لیا۔ جب ان کو جنگلوں میں خوراک نہ ملتی تو وہ عجیب و غریب جنگلی پھل کھاتے۔ بعض اوقات ان کو بنولے اور کچھوے کھانے پڑتے۔ اور یہ خوراک بھی بہت معلوم نہ ہوتی

پانی کے لئے وہ جانوروں کے پیچھے پیچھے ہو لیتے کہیں نہ کہیں دریا یا ندی نالہ مل ہی جاتا۔

جنگ کے سلسلے میں سپاہی کو جو مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں یہ ان کا بہت معمولی خاکہ ہے۔ اس کو اس سے بھی زیادہ شدائد کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہ تمام ہولناکیاں وہ اس لئے برداشت کرتا ہے کہ جس حکومت سے فوجی خدمت کی وہ تنخواہ وصول کرتا ہے۔ اس کی وفاداری کا تقاضا ہے کہ ان کو برداشت کرے۔

انسان بھی عجیب مخلوق ہے وہ فانی حکومتوں کی وفا میں اتنا سرگرم رہتا ہے۔ مگر اس کائنات کے اس حقیقی بادشاہ کی وفاداری اور ادائے حق کا اسے کبھی خیال نہیں آتا۔ جس نے اسے پیدا کیا۔ تمام سروسامان زندگی عطا کیا۔ اور پھر مرنے کے بعد بھی جس کی طرف لوٹ کر جانا ہے —— آہ یہ کتنی بڑی بھول ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔

ہماری پولیس

لاہور پولیس نے لارنس گارڈن سے جو لاہور کا ہائیڈ پارک ہے۔ چار نوجوان لڑکیوں کو تین نوجوان مردوں کے ہمراہ اس حال میں گرفتار کیا کہ وہ اپنے امام تمدن یورپ کی تقلید میں برگ و گل کے انبار میں داد عیش دے رہے تھے۔ یہ "سبعہ معلقہ" کالجوں کے چمنستان علم و دانش کا گل

سر سبز بنایا جاتا ہے۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیس نے ان کو کیوں گرفتار کیا۔ آخر ان کا قصور اس کے سوا کیا تھا، کہ جو نظری تعلیم وہ کتابوں کے ذریعے کالج میں حاصل کر چکے ہیں۔ اس کو تجربہ گاہِ عالم میں عملی جامہ پہنا رہے تھے۔ اگر بدکاری و بدکرداری کی پاداش میں گرفتار کر لینے کا حق پولیس کو حاصل ہے تو وہ لارنس گارڈن پر چھاپہ مارنے کی بجائے چھاپہ مارے مردانہ کالجوں پر، سینما ہالوں پر، بلکہ ان گھروں پر جہاں یورپ کی تہذیب کے پرستار والدین اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کو بدکاری و بدکرداری کے حوصلے دلاتے ہیں۔ شرم و حیا، غیرت و حمیت، اور عفت و تقویٰ کی متاع کو آگ لگتے دیکھنا اور اس کو نہ بجھانا۔ مگر جب اس کے شعلے بلند ہو کر آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ تو فائر بریگیڈ لے کر پہنچ جانا۔ خدا جانے کہاں کی عقلمندی ہے۔ شاعر نے اسی ڈرامے کے متعلق تو کہا تھا ؎

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین		پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

ہائے یہ مجبوری!

"ابھی کل کی بات ہے کہ آپ ہندوستان کے حاکم تھے۔ اور اب غلاموں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

بربے کاروانِ امت کے جرس کی آواز جو سنئے نے انا لائبہ ... انکیرقی ہے

مصلحین ملت نے گویا یہ بات طے کر دی ہے کہ مسلمان کو حکومت اور

ٹھاٹھ باٹھ اور دنیوی منافعوں کی لالچ ہی سے آمادۂ عمل کیا جا سکتا ہے اور ان کے دماغ اتنے بگڑ چکے ہیں کہ "رضائے الٰہی" اور اخروی ابدی کامرانی کی طرف تو جہات منعطف نہیں ہو سکتیں ——— بلکہ حق یہ ہے کہ خود ان مصلحین کو بھی خدا اور آخرت کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ورنہ کہنے کی بات تو یہ بھی کہ:۔

ابھی کل کی بات ہے کہ آپ لوگ خدا کے سچے غلام اور مومن تھے۔ ہر اشارۂ نبوت پر تمہارے اعضاء و جوارح متحرک ہو جاتے تھے۔ اور اخروی کامرانی اور لقائے الٰہی سے ورے ورے کوئی چیز تمہارے دل کو کھینچ نہیں سکتی تھی۔ مگر اب یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ خدا کی ہدایت سے باغی بنے ہوئے ہو اور اپنے محبوب نبی کی سن کر نہیں دیتے اور دنیا کے چمکدار مفاد پر ٹوٹے پڑتے ہو۔

مگر یہ بات اگر مسلمانوں کے اکابر کہنے لگیں تو کئے کرائے سارے پہ پانی پھر جائے مجبوراً اسلام کو پیچھے کر کے دنیا کو آگے لاتے ہیں۔ ہائے یہ مجبوری!

بیچارہ مولوی

ایک جریدہ نے ایڈیٹوریل لکھا ہے کہ "یہ مولوی" اِدھر کانگرس کے گڑھ سے کہتا ہے کہ جو کانگرسی نہیں وہ اسلام سے خارج اور اُدھر "مولوی" ہی لیگ کے لاؤڈ اسپیکر سے کہتا ہے کہ جو لیگی نہیں وہ صاف کافر ہے! اور مولوی کی اس دو رنگی کو پیش کرنے کے بعد وہ اپیل کرتا ہے کہ لوگو! اس مولوی سے قوم کو

بچاؤ۔

یہ ہے وہ حالِ زار جو "مولوی" نے مسلمانوں کے ہر اُلٹے سیدھے میں "ہاں کاروں" یا طلبینت اختیار کر کے پیدا کیا ہے۔ یہ نتیجہ ہے اسلام کا دامن چھوڑ کر مسلمان گروہوں کی دُم پکڑنے کا کہ اب دُم پکڑنے کے منصب سے بھی لوگ اسے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ علمائے محترم آگے ہو گئے ہوتے انہوں نے پیچھے ہو کے چلنا سیکھا اور اب لوگ انہیں پچھلی صفوں میں بھی جگہ دینے سے انکاری ہو رہے ہیں۔ اسلامی سیاست انہیں آتی نہیں اور دنیوی سیاست میں وہ دین ناآشنا مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت پست واقع ہوئے ہیں۔ لہٰذا دنیوی مورچے پر انہیں کلیدی منصب تو کوئی کیا دیگا، سنتری یا بگلر کے عہدے ان کے لئے تجویز کئے جاتے ہیں۔ اور اس حال میں علماء کے ساتھ علم دین کی جو تذلیل ہوتی ہے اس پر کس کا دل نہ کڑھے گا۔ بجز خود علمائے دین کے!

دارالحرب

ہندوستان کے مسلمانوں نے نظامِ باطل کے ساتھ خود کو سازگار کرنے اور اسلام کی مقرر کی ہوئی حدود کو توڑنے کے لئے جو بہانے تراش رکھے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ دارالحرب ہے۔ ایسا دینداروں سے دیندار مسلمان کا استدلال جب وہ کفر و باطل سے مفاہمت کرنے کا ارادہ کر چکا ہوتا ہے

"ہندوستان دار الحرب ہے۔ اس لئے تمام غیر مسلم قومیں حربی ہیں۔ اور حربی کے ساتھ سود و قمار کا معاملہ کرنے کی اجازت بعض فقہا نے بھی دی ہے۔ لہذا بنکوں میں روپیہ رکھنا جائز ہے۔ غیر مسلموں سے سود لینا درست ہے۔ اور قمار کی آمدنی وصول کرنے میں بھی حرج نہیں۔" اس کے بعد لاٹری بھی درست، جوا بھی جائز۔ سود خواری بھی حلال۔ بیمہ کرانا بھی مناسب۔

قطع نظر اس کے کہ دار الحرب کے بارے میں فقہائے اسلام نے جو حدود متعین فرمائی ہیں۔ ان میں بھی سود و قمار کو حلال قرار نہیں دیا گیا۔ اور بنک اور سود خواری کا جو نظام قائم ہے اس کی رو سے مسلمان "حربیوں" ہی سے سود وصول نہیں کرتے بلکہ اس "جہاد" کا نشانہ مسلمان بھی بنتے ہیں۔ غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان دار الحرب ہے تو کیا مسلمانوں نے یہاں علم جہاد بلند کر رکھا ہے۔ اور نظام کفر و باطل کا تختہ الٹنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے کہ حالات جنگ کے باعث شرعی حدود میں کچھ توسیع کر دی گئی ہو؟ جب مسلمان نہایت امن و اطمینان سے نظام کفر و باطل کے ساتھ مفاہمت بلکہ اس کی اطاعت کا عہد کر کے زندگی بسر کر رہے ہوں تو غریب ہندوستان کو دار الحرب کیوں کہئے۔ دار الامن ہی کیوں نہ قرار دیجئے۔ کیا تماشہ ہے کہ سود کھانے کے لئے تو ہندوستان دار الحرب ہو اور جہاد کا نام آئے تو دار الامن بن جائے۔

خدا کی حکومت

مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت کی صوبائی کونسل کے اجلاس میں

ایک رکن نے اس مضمون کی قرارداد پیش کی کہ پاکستان کا نظام حکومت حکومت الٰہیہ کے اصولوں پر ہو۔ اور چند ارکان نے اس کی تائید بھی کی۔ مگر ایک رکن نے مخالفت کرتے ہوئے فرمایا کہ نظام عالم پر تو پہلے ہی حکومت الٰہیہ قائم ہے۔ شجر و حجر، جن و انس، بحر و بر، کوہ و وادی سب احکام الٰہیہ کے تابع ہیں۔ اس لئے حکومت الٰہی تو پہلے ہی قائم ہے۔ اب اس کو پھر قائم کرنے کا کیا مطلب، اس کے بعد ارشاد ہوا۔ پاکستان میں مسلمانوں کو وہی آئین قبول ہو گا جو احکام قرآنی کے مطابق ہو گا۔ اور اسی ارشاد کو فیصلہ کی اہمیت حاصل ہوئی۔

حکومت الٰہیہ کے متعلق یہ کتنی بڑی غلط فہمی ہے جو ارباب فکر و دماغ پر مسلط ہے۔ دوسروں کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے۔ مگر اس قرارداد کا جو مفہوم ہم سمجھ سکتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ جس طرح تکوینی اعتبار سے شجر و حجر، جن و انس، بحر و بر، اور کوہ و وادی پر اللہ کی حکومت و فرمانروائی قائم ہے۔ اسی طرح تشریعی لحاظ سے انسانی زندگی کے اسلوب کے لحاظ سے دستور حیات کی رو سے خدا کی زمین پر خدا ہی کی حکومت ہو۔ یعنی اسی کا قانون نافذ ہو۔ اسی کا فرمان چلے۔ اور یہ ایسی شے ہے جو اس امر کا انتظار نہیں کر سکتی کہ پاکستان قائم ہو تو اختیار کی جائے۔ اور جب تک قائم نہ ہو اس وقت تک ہم خدا کے باغی ہونے کی حیثیت میں جئے جائیں۔ قرآن صرف پاکستان کے قیام کے بعد ہی کے لئے نہیں بلکہ اس سے پہلے کے لئے بھی ہے۔

اسی طرح نواب زادہ لیاقت علی خاں نے بھی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا تھا کہ "جو لوگ حکومت الٰہیہ قائم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جب تک تمہارے پاس کوئی خطۂ زمین نہ ہو۔ تم حکومت الٰہی کہاں قائم کرو گے۔

نواب زادہ صاحب کے نزدیک صرف خطۂ زمین کے حاصل ہونے کی دیر ہے۔ جس روز وہ حاصل ہو گیا۔ اسی روز وہ حکومت الٰہی اس میں قائم کر دیں گے۔ لیکن ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت الٰہیہ کی رعایا موجود نہ ہوئی۔ تو اس خطۂ زمین میں حکومت الٰہیہ کا نفاذ کس پر ہو گا۔ کیا ترکوں کے پاس خطۂ زمین نہیں۔ کیا ایران خطۂ زمین نہیں۔ کیا افغانستان خطۂ زمین نہیں۔ پھر کیا وہاں خدا کی حکومت قائم ہے۔ خدا کے قانون کا چلن ہے۔ دور کیوں جایئے۔ کیا نوابزادہ صاحب کے پاس جاگیر نہیں۔ کیا خود نوابزادہ صاحب کے پاس اپنا گھر نہیں اپنا وجود نہیں۔ پھر کیا انہوں نے اس جاگیر میں حکومتِ الٰہیہ قائم کر دی ہے۔ ان کے گھر میں دین کا غلغلہ بلند ہے۔ خود ان کی ذاتِ گرامی پر خدا کی حکومت قائم ہے ——
اور اگر نہیں تو پھر حکومتِ الٰہیہ کے لئے خطۂ زمین کی جستجو کا کیا مطلب اور خدا کی رعایا بننے کی جدوجہد کی بجائے خطۂ زمین کے حصول کا انتظار کیسا یاد رہے کہ حکومتِ الٰہیہ خطۂ زمین کی طلبگار نہیں بلکہ رعایا کی طلبگار ہے۔ ہاں خدا کی رعایا کو خطۂ زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ اس پر امن و عافیت

سے زندگی بسر کر سکے۔

غدار و باغی

لاہور میں ایک مسلم لیگ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ملک خضر حیات کو غدار اور باغی کا خطاب دیا گیا۔ خضر حیات کا گناہ یہ تھا کہ اس نے مسلم لیگ کے ہائی کمان کی اطاعت کرنے اور صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ وزارت بنانے سے انکار کر دیا۔ وہ زبان سے یہ کہتا رہا کہ میں مسلم لیگ کا تابع فرمان ہوں۔ پاکستان کا حامی ہوں۔ مسلمانوں کا خادم ہوں۔ مگر مسلم لیگ کے ہائی کمان نے اس زبانی اقرار اطاعت اور اعلان عقیدت کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی۔ اس لیے کہ اس زبانی اقرار کے پیچھے عملی اطاعت اور قبول احکام کا کوئی ثبوت نہ تھا۔

کانفرنس میں جتنے مسلمان تھے۔ سب نے ملک خضر حیات کو غدار و باغی قرار دیا۔ لیکن بہت کم ہوں گے جنہوں نے اپنے اس فیصلے اور نظریے کے مطابق اپنی حالت پر غور کیا ہوگا۔ کیا اسلام کا زبانی اقرار اور ایمان کا مجرد اعلان جب تک کہ اس کے ساتھ خدا کی اطاعت اور احکام اسلام کی پیروی کا کوئی ثبوت نہ ہو مسلمانوں کو اسلام کا مطیع قرار دے سکتا ہے۔ کیا اسلام اور خدا کا حق مسلمانوں پر مسلم لیگ اور اس کے ہائی کمان کے برابر بھی نہیں ہے۔ اگر خضر حیات نے پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت قائم کرنے کی ہامی نہ بھرے۔ تو

غدار و باغی ہے۔ لیکن ان مسلمانوں کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اپنی ذات پر خدا کی حکومت اور خدا کی زمین میں قانون الٰہی کے نفاذ کی جدوجہد نہیں کرتے۔ مگر سمجھتے ہیں کہ محض مسلمان کہلا لینے سے نجات پا جائیں گے۔

اقتصادی مسئلہ

"کیا پشاور سے لیکر کلکتہ اور کلکتہ سے بمبئی تک ہم کسی معقول بنک کو چلا رہے ہیں۔ کیا ملک کی بنیادی صنعتوں میں ہمارا حصہ ہے۔ کیا آج تک ہم نے بیمہ لائن میں ترقی کی ہے۔ کیا اس برا عظم میں کوئی مسلم انشورنس کمپنی حقیقی معنوں میں موجود ہے۔ فلمی صنعت جو آج سرمایہ اور آمدنی کے لحاظ سے ملک کی چوتھی صنعت ہے۔ کس حد تک ہماری ممنون احسان ہے۔ بے شک ہم کپڑے کے کارخانوں کو مستری لوہے کے کارخانوں کو کاریگر، شکر ساز فیکٹریوں کو مزدور کاغذ کی ملوں کو، بوجھ اٹھانے والے، جارکی حرفت کو، قلی انشورنس کمپنیوں کو ایجنٹ اور فلم ساز اداروں کو طوائفیں اور میراثی بڑی فیاضی اور فراخدلی کے ساتھ مہیا کر سکتے ہیں۔ لیکن خود کسی صنعت کی سربراہی نہیں کر سکتے"

مسلمانان ہند کے اقتصادی زوال اور اس کے علاج پر غور کرنے کے سلسلے میں ایک اخبار کے مسلمان چیف ایڈیٹر نے اوپر کی سطور لکھی ہیں۔ مضمون نگار کو حسرت ہے کہ مسلمان بیمہ کمپنیاں اور بنک جاری کر کے سود خواری کیوں نہیں کرتے۔ اور فلمی صنعت کے ادارے قائم کر کے مسلمان طوائفوں

اور میراثیوں کو ملت اسلامیہ کا اقتصادی مسئلہ حل کرنے کے لئے استعمال کیوں نہیں کرتے۔

حسرت بڑی حسرتناک ہے۔ مگر اسلام کے مسئلے سے بے نیاز ہو کر جب مسلمانوں کے اقتصادی مسئلے پر غور کیا جائے گا تو نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلے گا۔ بہر حال اگر مسلمانانِ ہند کا اقتصادی مسئلہ اسی طرح حل ہو سکتا ہو۔ تو حل کر کے دیکھ لینا چاہیے۔ بلا سے ایمان جاتا رہے گا۔ تاہم ہماری قوم میں ابھی کچھ برلا، کچھ پنجیلی، کچھ ڈالمیا تو پیدا ہو جائیں گے۔ مسلمان قوم کی طوائفیں اور میراثی غیر قوموں کے کیوں کام آئیں۔ ان کو ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے کیوں استعمال نہ کیا جائے ——— یہ ہے مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ اور اس کا حل ———

خارجیوں کا نعرہ

بعض بزرگوں کے متعلق مشہور ہے کہ اگر اُن کے سامنے یہ آیت پڑھی جاتی قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ ۔ اے محمدؐ! اعلان کر دو کہ میں تو تمہارے ہی جیسا انسان ہوں۔ جس پر خدا کی وحی نازل ہوتی ہے۔ تو بگڑ کر کہتے ہیں کہ تم ہمیں چڑانے کے لئے وہابیوں والی آیتیں پڑھتے ہو۔ ممکن ہے یہ محض ایک لطیفہ ہو۔ مگر ایسے فیلسوف فی الواقع موجود ہیں کہ اگر ان سے کہئے کہ حکومت و فرمانروائی اللہ ہی کے لئے ہے۔ اور اسلام کی رو سے انسان

کا نصب العین یہ ہے کہ دنیا پر خدا کی حکومت قائم کر دے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ ان الحکم الا للہ (حکم اللہ ہی کے لئے ہے) تو وہ نہایت سنجیدگی سے فرماتے ہیں کہ یہ تو خارجیوں کا نعرہ ہے۔ حالانکہ یہ خارجیوں کا نعرہ نہیں اللہ کا ارشاد ہے۔ اور اگر خارجیوں نے اس کو حضرت علیؓ کی مخالفت کے لئے استعمال کیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اب یہ جملہ قرآن مجید سے نکل گیا۔ اور اگر خدا کی زمین پر طاغوت کی فرمانروائی کا تخت بچھا ہوا ہو اور اسے اس کی جگہ سے ہٹانے کے لئے اعلان کیا جائے کہ ان الحکم الا للہ تو گھبرا کر کہہ دیا جائے کہ یہ خارجیوں کی سی بات ہے۔ یہ بات اگر حضرت علیؓ کے خلاف کہی جائے تو خارجیوں کا نعرہ ہے مگر جب طاغوت کے خلاف کہی جائے تو عین اسلامیت کا نصب العین ہے۔

روشن خیالی

ایک صاحب جو اپنے آپ کو روشن خیال بھی کہتے ہیں انشورنس (بیمہ) اور سود دینے کے متعلق دریافت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شریعت کی رو سے جائز ہے یا ناجائز اور ان سے کیا اصولی نقصان ہے۔

گذارش ہے کہ جو لوگ فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ نظام باطل کے ہر شعبے کے ساتھ تعاون کر کے زیادہ سے زیادہ مالی اور اقتصادی فوائد حاصل کرتے رہیں گے۔ ان کے سامنے ایمان و اسلام پر قائم رہنے اور ان کو قائم

رکھنے کا سوال ہی نہیں بلکہ حیات دنیا کے منافع کا حصول ہے۔ تو ان سے تو بحث کرنا ہی فضول ہے۔ ان کو تو ایمان و اسلام کی اہمیت پہلے سمجھائیے اور کفر و باطل کے اتباع کے نقصانات بتائیے۔ لیکن جو لوگ باطل کے اس غلبۂ عمومی کے باوجود ایمان و اسلام کو عزیز رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ عذاب آخرت سے بچ جائیں۔ ان کو صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ انشورنس تمام تر سود پر مبنی ہے۔ اور سود کھانا نص قطعی کی رو سے ناجائز اور حرام ہے۔ باقی رہا سود دینا تو اس کی ممانعت لسان رسالت نے فرما دی ہے۔ اور سود ہی کاروبار سے ہر قسم کا تعلق رکھنا آتش جہنم کو دعوت دینے کے مرادف قرار دیا ہے۔

یہ تو ہوئی انشورنس اور سود دینے کی اسلامی حیثیت۔ اب رہا سوال ان روشن خیال حضرات کا جو خدا اور رسول سے بھی زیادہ دانشمند بننا چاہتے ہیں۔ تو ان کی حالت عجیب ہے۔ ایک طرف ان کی روشن خیالی کا یہ عالم ہے۔ کہ وہ اقبال کا یہ شعر جھوم جھوم کر گاتے ہیں ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

اور مارکس اور لینن کے حضور اپنی پاک پیشانیاں جھکاتے ہیں اور دوسری طرف سرمایہ داری کی اولین بنیاد کی طرف دوڑتے ہیں تو معلوم ہوا کہ عقل تو ان کی بھی تسلیم کرتی ہے کہ یہ سود خواری کا پورا نظام، نظام باطل ہے مگر مال کی حرص ان کو اسلام کے نظام سے بھی بدظن کر دیتی ہے۔

تہذیب فرنگ کا تحفہ

امریکہ نے دو ایٹم بم پھینکے۔ آٹھ دس لاکھ جاپانیوں کو اور دو آباد شہروں کو صفحۂ ہستی سے نابود کر ڈالا۔ انگلستان کے وہائٹ ہال اور امریکہ کے وہائٹ ہاؤس نے کہا کہ یہ سفید فام اقوام کی سیاست کا ایک رنگین تحفہ ہے جسے زرد اقوام کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے ——— جان مال اور تعمیرات کی بربادی۔

لیکن ذرا صبر کیجئے ابھی سفید اقوام کے اخلاق اور ان کی تہذیب نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ وہ بھی مشرق کو اپنا ایک خوبصورت تحفہ دینا چاہتی ہے۔ لیکن اس میں کچھ دیر لگے گی کم از کم نو ماہ ——— گردش لیل و نہار نے یہ مدت بھی گذار دی اور جاپان سے یہ اطلاع موصول ہو گئی کہ امریکی سپاہیوں اور جاپان کی عورتوں کے اختلاط کے نتیجے میں ۱۴ ہزار ناجائز بچے عنقریب پیدا ہونے والے ہیں ——— تہذیب و اخلاق فرنگ کے تحفے ——— خوبصورت کھلونے کھیلتے کودتے۔ آنغوں آنغوں کرتے اپنی عصمت باختہ ماؤں کی گودیوں میں ہمکتے ——— تہذیب و اخلاق فرنگ کے تحفے! ——— اور ہمارے بعض جبہ پوش اور مصلی در بغل بزرگوں کا ارشاد ہے کہ اس تہذیب و سیاست کے پرستار پیروان حق پر غالب آجائیں تو خود حق ان کو اجازت دیتا ہے کہ اطاعت کریں، خدمت کریں، تعاون کریں اور اس کے حملے

میں جو گلیاں ملیں ان کو حلال وطیب سمجھیں۔

شاگردوں کا کمال

لکھنؤ کی ایک اطلاع ہے کہ امسال لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبا نے ایک نئی شان کی ہولی کھیلی۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندو جب ہولی کھیلتے تھے تو بھبوت ملے عجیب عجیب شکلیں بنائے ہاتھوں میں رنگ کی پچکاریاں لئے ٹولیاں بنا کر بازاروں اور گلیوں میں نکلتے۔ ہر راہ گذر پر رنگ اور گلال وعبیر پھینکتے ہنستے کھیلتے قہقہے لگاتے دیوانوں کی سی حرکتیں کرتے چلے جاتے تہذیب ومتانت افسوس کرتی کہ یہ اچھے خاصے مردانِ معقول کو کیا ہو گیا ہے۔ اور بس مگر اب مغربی تہذیب کا دور دورہ ہے۔ اس تہذیب کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے لکھنؤ میں نئی قسم کی ہولی کھیلی۔ ایک جلوس نکلا ناچتا کودتا۔ بدمست و بدحواس۔ لڑکیوں کے ایک ہوسٹل پر حملہ آور ہوا۔ اس کے دروازے توڑ ڈالے۔ صنفِ نازک میں کہرام مچ گیا ——— اور ایک لڑکے اور لڑکی نے پانیر میں مراسلے شائع کرائے ہیں جن میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ اس روز لڑکیوں کے ہوسٹل میں عصمت کا محل کھنڈر ہو کر رہ گیا۔

ہندوستانی ایک مدت سے اہلِ فرنگ کی تقلید وشاگردی کی راہ پر دوڑ رہے تھے آج وہ فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ شاید اس قسم کا واقعہ کسی امریکی یا یورپی ہوسٹل میں بھی پیش نہیں آیا ہوگا۔

پاگل

لاہور شہر کے باہر میونسپلٹی نے تفریح کے لئے پارک بنا رکھے ہیں۔ ایک روز کا ذکر ہے باغ کے جنگلے کے باہر سڑک کے کنارے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ سب لوگ اندر کی طرف پارک میں دیکھ رہے تھے۔ جہاں نہ کوئی قومی جلسہ ہو رہا تھا نہ کوئی مداری تماشا دکھا رہا تھا اور نہ لڑکے پتنگ اڑا رہے تھے۔ مگر لوگ دیکھ رہے تھے اور امنڈ امنڈ کر دیکھ رہے تھے۔

میں نے تانگے والے سے پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ اس نے جواب دیا۔ "ایک پاگل عورت گھاس پر پانی میں پھر رہی ہے۔ یہ لوگ اس کو دیکھ رہے ہیں"۔ ——— میں نے کہا پاگل وہ عورت نہیں ہے پاگل یہ لوگ ہیں جو اپنی دانست میں صاحب عقل و شعور ہیں۔ پاگل عورت تو اپنی مصیبت میں مبتلا ہے۔ عقل سے محروم ہونے کے سبب اس کا یہی کام ہے۔ کہ وہ بے مقصد اور بے ضرورت یونہی گھومتی پھرے، مٹی، پانی، گھاس اس کے لئے برابر ہے۔ مگر ان "عقلمندوں" کو کیا ہو گیا ہے جو اپنا کام کاج اپنا مقصد اور غرض، اپنا رستہ اور منزل بھولے بیٹھے ہیں۔ اور ایک پاگل عورت کی حرکات دیکھنے میں مصروف ہیں۔

آپ میری رائے سے اتفاق کریں گے۔ مگر آپ نے کبھی سوچا کہ اس قسم

سے پاگل پن میں آپ بھی مبتلا ہیں۔ یہ کفر و باطل کے پیرو۔ جن کے کانوں تک پیغام حق نہیں پہنچا۔ جن کو ہم مسلمانوں نے نظام اسلامی کی دعوت نہیں دی۔ یہ پیروان باطل خدا کے دین کے شعور سے محروم ہو کر پاگلوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ بے مقصد، بے شعور، بے عقلی پر مبنی زندگی کے میدان میں وہ آوارہ پھر رہے ہیں۔ خدا سے بے خبر، آخرت کے منکر ـــــ اخلاقی نظام سے بے بہرہ، خدا کے دین سے بے پروا ـــــ پاگل بالکل پاگل ـــــ مگر جو لوگ مسلمان کہلاتے ہیں، جن کے پاس خدا کا پیغام پہنچ چکا ہے۔ جو کتاب الٰہی کے حامی ہیں۔ جن کو دین کا شعور، اسلام کی عقل، حق کی روشنی مل چکی ہے، وہ پیغام حق، کتاب الٰہی دین خدا، نور اسلام کی پیروی کرنے کی بجائے۔ پیروان کفر و باطل کے بنائے ہوئے نظام زندگی کے گرویدہ ہو رہے ہیں۔ اس کی دید میں محو ہیں۔ اس کے مطابق زندگیاں گزار رہے ہیں ـــــ پاگل پیروان کفر و باطل نہیں۔ پاگل پیروی حق کے مدعی ہیں۔ گمراہ وہ نہیں یہ ہیں۔ خدا کی روشنی سے محروم وہ نہیں یہ ہیں۔ حیرت ان پر نہیں ان پر ہے۔ وہ تو کفار کے گھر پیدا ہوئے اور خدا کے دین سے ناواقف رہے۔ وہ گمراہی کی مصیبت میں مبتلا پیدا ہوئے۔ اور مبتلا ہو کر جیے۔ مگر ان کی گھٹی میں تو خدا کے دین کی امانت تھی۔ یہ کیوں کافرانہ نظام حیات کے شیدائے فریب ہوئے ـــــ غور کر کے بتائیے ذمہ داری کس پر

زیادہ ہے۔ جوابدہی کس پر سخت ہے۔ کون زیادہ سزا دار مجرم ہے۔
——— آہ! اگر اس کا احساس ہو جائے تو سارے عذر اور بہانے ایک لمحے میں ختم ہو جائیں۔

قومی خدمت

ایک مقامی معاصر اپنے "فکاہات" کے کالم میں رقمطراز ہے:۔
"آج کل "زندہ رقص" کی وبا بری طرح پھیلتی جا رہی ہے اگر دنیا کو بلی ناچ کرنے کا حق پہنچتا ہے، لیکن میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ لاہور میں ایک مسلمان لڑکی نے ہندوانہ نام رکھ کر رقص کا ایک اسکول کھول رکھا ہے۔ اور وہ مسلمان لڑکیوں کو یہ کہہ کر اپنے دام میں پھنسا رہی ہے کہ زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے رقص بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ہندو لڑکیوں کے لئے۔ سبحان اللہ! کیا "قومی خدمت" ہے۔
کتنا بڑا ظلم ہے بے چاری اس مسلمان لڑکی پر جس نے مسلمان قوم کی ایک اہم کمی کو پہچانا، اور اسے دور کرنے کا تہیہ کیا۔ بجائے اس کے کہ اس جذبۂ خدمت پر اسے مبارکباد دی جاتی، بیچاری پر "سبحان اللہ" کے طنزیہ تیر برسائے جاتے ہیں۔ بھلا مسلمان قوم کی اس درد مند بیٹی کی "ملی غیرت" کیونکر گوارا کر سکتی تھی کہ دنیا کو بلی اور دوسری "کافر" لڑکیاں اسٹیج پر آکر زندہ رقص کریں اور "مسلمان" تماشائیوں

سے خراج تحسین وصول کریں ـــــ کتنا بڑا قومی خسارہ تھا یہ ـــــ زندہ رقص کا آرٹ بھی سو فیصدی غیر مسلموں کے ہاتھوں میں چلا جاتا اور اگر کبھی "اسلامی رقص گاہ" کا افتتاح کیا جاتا تو اس کے لئے مسلمانوں کو کافروں کا محتاج ہونا پڑتا۔

اس خطرۂ عظیم کو "اسلام" کے سر سے ٹالنے کے لئے یہ لڑکی جو "قومی خدمت" انجام دے رہی ہے وہ لائق صد تحسین و آفرین ہے نہ کہ قابل طنز و تشنیع۔ پھر یہ "مسلمان لڑکی" دوسری مسلمان لڑکیوں کو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کی جو تلقین کر رہی ہے تو کون سی نئی بات ہے، آخر ہمارے راہنماؤں کا بھی تو یہی ارشاد ہے ؎ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

البتہ اس مسلمان لڑکی سے ایک غلطی ضرور سرزد ہوئی، شاید اس میں اخلاقی جرات نہیں تھی یا اس نے قوم کی "غیرت" کا اندازہ صحیح نہیں لگایا، ہندوانہ نام رکھنے کی بجائے اپنے "اسلامی" نام ہی سے اس "مبارک قومی خدمت" کا آغاز کرتی تو قوم اسے سر آنکھوں پر بٹھاتی، بڑے بڑے قومی لیڈر اس کی خدمت میں مبارکباد کا پیغام بھیجتے اور اس کا شکریہ ادا کرتے کہ اس نے مسلمان قوم پر آنے والے خطرے کا بروقت اندازہ لگایا ـــــ پھر وہ یہ بھی دیکھتی کہ "سبحان اللہ" کے تیر برسانے والے بھی اس کے اور اس کی شاگردوں کے زندہ رقص پر رقص گاہ کی فضاؤں میں سر دھن رہے اور اس کی اس "قومی خدمت" کے صلے میں واہ واہ کی داد دے رہے ہیں۔

اس پر تعجب کا اظہار نہ کیجئے، اگر قوم کا فرزانہ سیاست میں مسلمان لیڈر رہنے کے بڑھ بڑھ کر حصہ لینے پر زندہ باد کے نعرے مار سکتی ہے۔ اگر سود خواری کے اڈے قائم کرنے اور اسلامی بنک کھولنے پر مرحبا اور احسنت پکار سکتی ہے تو "اسلامی رقص" کے اداروں کے قیام پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے کیوں نہیں برسا سکتی عیب کی بات تو معیوب اس وقت ہے جب اس کا ارتکاب کا فرانہ ناموں سے کیا جائے۔ گناہ کو "مسلمان" کر لینے کے بعد تو گناہ، گناہ نہیں رہتا صواب ہو جاتا ہے۔

انفرادی اور اجتماعی معصیتیں

اوپر کے شذرے کو پڑھ کر ایک دوست احمد آباد سے لکھتے ہیں کہ آپ رقص اور رنڈیوں اور سینما پر بحث کرتے ہوئے، بنک اور اسمبلیوں کی جدوجہد کو بھی اسمیں شامل کر دیتے ہیں اور ان کو بھی ایک جیسا تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں بہت بڑا فرق ہے۔ کیا آپ کے نزدیک رنڈیوں کا ناچ۔ بے حیا عورتوں کا رقص، بدمعاشوں کی سینما اور اسمبلیوں کی جدوجہد اور بنک کے ذریعے کاروبار کو وسعت دینا ایک جیسا ہے؟"

ہم اپنے دوست کے اس انتباہ پر بے حد شرمسار ہیں، ہم سے سخت غلطی ہوئی کہ ہم نے رنڈیوں کے رقص۔ بے حیا عورتوں کے ناچ اور فسق و فجور کے اڈوں ــــــ سینما ــــــ کو بنکوں کے سودی

کاروبار اور اسمبلیوں کی قانون سازی کو جو اللہ کے حق تشریع کے خلاف عملاً اعلان جنگ ہے ایک جیسا قرار دیا ——— رنڈی جب رقص کرتی ہے تو اس سے صرف اوباش لوگ متاثر ہوتے ہیں اور اپنے اخلاق کو برباد کرتے ہیں۔ بے حیا عورتیں جب ناچتی ہیں تو صرف بداخلاق لوگوں کی نگاہیں سرور اندوز ہوتی ہیں۔ سینما کی فسق انگیزی بھی محدود ہوتی ہے۔ مگر یہ بنکوں کا سودی کاروبار تو قوموں کی قوموں کو برباد کرتا اور انسانی معاشرہ کو تباہ کرتا ہے۔ اور یہ اسمبلیاں تو براہ راست خداوندی کا اعلان کرتی ہیں۔ اور رقص و سرود سینما اور تمام فواحش کے دروازے کھولتی ہیں ——— ——— ہم سے سخت غلطی ہوئی۔ کہاں انفرادی معصیتیں اور کہاں خدا و رسول کے دین کے خلاف اجتماعی بغاوت!

بحمد اللہ!

(۱) ایک شخص کی کمر جھک کر کمان ہو چکی ہے۔ چہرے پر جھریاں گذری ہوئی عمر کے نقوش قدم کی خبر دے رہی ہیں۔ سر اور ریش کے بالوں کی سفیدی بگلے کے پروں سے چشمک زنی کر رہی ہے۔ پوپلا منہ ارذل عمر کی کہانی سنا رہا ہے۔ آپ بڑھ کر ادب سے کہتے ہیں بڑے میاں سلام!

مگر بڑے میاں جریب اٹھا کر لپکتے ہیں کہ اس گستاخی کی سزا دیں اور کہتے ہیں نامعقول ہمیں بڑے میاں کہتے ہو۔ ہمیں پیر فرتوت سمجھتے

ہو جانتے نہیں کہ ہم بحمد اللہ جوان ہیں!

(۲) ایک شخص کا معدہ جواب دے چکا ہے۔ جگر نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے کھچڑی اور ساگو دانے کی کھیر بھی ہضم نہیں ہوتی۔ بھوک نے صورت دکھانی ترک کر دی ہے۔ پانی کا گھونٹ پینے سے کھٹی ڈکاریں آنے لگتی ہیں کھڑا ہو تو سر چکرا جاتا ہے، تھرما میٹر بخار کا پتہ دیتا ہے، نبض کی حرکت بیقاعدہ ہے۔ طبیب اور تیماردار کہتے ہیں۔ جناب والا کی طبیعت خراب ہے۔ صحت درست نہیں ہے علاج کی فکر کیجئے، ـــــ مگر وہ شخص یہ سن کر صلواتیں سناتا ہے اور غصے میں آکر کہتا ہے مجھے بیمار کیوں بتاتے ہو۔ دیکھتے نہیں کہ میں بحمد اللہ تندرست ہوں بالکل تندرست!

(۳) ایک فرزند اسلام کانگریس کا ہر آنے والا ممبر ہے۔ کانگریس کے جلوسوں میں شامل ہو کر "جے ہند" کا نعرہ لگاتا ہے۔ اور کھدر میں ہوس پھرتا ہے۔ ووٹ کا وقت آتا ہے تو اپنا ووٹ کانگریس کے امیدوار کو دیتا اور دلاتا ہے۔ کانگریس کے پروگرام کا پرچار کرتا ہے۔ کانگریس کمیٹی اسے سیکرٹری بناتی ہے تو سیکرٹری اور صدر بناتی ہے تو صدر بن جاتا ہے کانگریس کی طرف سے جلسہ ہوتا ہے تو دیش بھگتی سے لبریز تقریریں کرتا ہے۔ اور گاندھی جی کی مورتی کو دو ہاتھ جوڑ کر سلام بھی کر لیتا ہے۔ ایک مسلم لیگی بھائی اس سے عرض کرتا ہے کہ یہ قوم سے غداری ہے۔ یہ ہندوؤں کی ہمنوائی ہے۔ یہ مسلم لیگ سے بغاوت ہے۔ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ ـــ

——— مگر جواب میں وہ پیکرِ اخلاص بن کر اور چہرے پر دردِ اسلامی کا کرب پیدا کر کے اور لہجے میں اسلام کا جلال نمایاں کر کے پکارتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ میں غدّارِ قوم ہوں، بحمداللہ کہ میں مسلم لیگی ہوں، بحمداللہ کہ میں پاکستانی ہوں اس لئے کہ میرے دل میں قوم کی محبت ہے۔ اور میں نے ۲ر کے فارم پر دستخط بھی کر دیئے ہیں۔ میرے اعمال کو نہ دیکھو! میرے افعال کو نہ دیکھو میرے قول کا لحاظ کرو۔

فرمایئے کیا خیال ہے اوپر کے تینوں حضرات کے ارشادات کے متعلق۔ آپ ان کے اخلاص و صداقت کا اعتراف کریں گے؟ بڑے میاں کو کوئی جوانوں کا سا کام سپرد کر دیں گے۔ مریض سے تندرستوں کا سا کام لیں گے۔ کانگریسی کو مسلم لیگ کا عہدیدار نہیں اپنے جلسے کا صدر بھی بنانا قبول کریں گے ——— نہیں کیونکہ یہ کھلا ہوا تضاد ہے۔ کھلی ہوئی غلط بیانی ہے۔

لیکن ایک شخص ہے جو کہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ میں نماز نہیں پڑھتا یہ بھی صحیح ہے کہ میں برج کے نام سے جوا کھیلتا اور ڈرنگ کی اصطلاح میں شراب پی لیتا ہوں۔ ملازم ہوں رشوت لے لیتا ہوں، جھوٹ بھی بول لیتا ہوں۔ تاجر ہوں تول ناپ میں اسلامی اصولوں کو ملحوظ نہیں رکھتا۔ کفر و باطل کی مشین کا پرزہ بھی ہوں، قتال فی سبیل الطاغوت سے بھی عار نہیں بشرطیکہ اچھی تنخواہ ملے۔ قانون الٰہی کی بجائے اپنے فیصلے غیر الٰہی قوانین سے طلب

کرتا ہوں۔ جائیداد کی تقسیم میں پنجاب کے انتقال اراضی اور اودھ کے قانون رواج پر عامل ہوں۔ یہ سب صحیح ہے ـــــــ مگر بحمداللہ میں مسلمان ہوں۔ اس لئے کہ میرے دل میں اسلام کا درد ہے میں کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھتا ہوں۔ یا پڑھ چکا ہوں۔ میرا شمار مسلمانوں میں ہوتا ہے۔ باقی رہا احکام اسلام کی پیروی قانون الٰہی کی اتباع تو یہ استطاعت اور ہمت پر منحصر ہے۔ اور اپنی ہمت اور استطاعت کا فیصلہ میں ہی کر سکتا ہوں کسی شخص کو مجھ پر اعتراض کرنے کا حق نہیں ـــــــ اور کون ہے جو کہہ سکے کہ یہ تضاد ہے۔ اور اسلام کی برکات اس تضاد کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ اور کتنے ہیں جو اس تضاد کو محسوس کرتے ہیں۔ اور اس کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے کہ جھٹ خلافت راشدہ کی تاریخ کے اوراق کھول کر "باب خوارج" کا مطالعہ شروع کر دیں گے۔ گویا خوارج نے جب صحابہ کرام کے متعلق گستاخانہ لب کشائی کی تھی تو اس کی نوعیت بالکل وہی تھی جو آج کے مسلمانوں کو اپنی زندگی سے تضاد دور کرنے کی دعوت کی ہے۔ حالانکہ خوارج جن پیکران قدس کے اسلام و ایمان کا انکار کرتے تھے۔ ان کے اسلام و ایمان کی شہادت خدا نے دی تھی۔ اور ان کے جنتی ہونے کی بشارت رسول نے فرمائی تھی۔ اور ان کی زندگیاں مکمل طور پر نظام اسلامی کی پابند تھیں۔ مگر آج جن مسلمانوں کو صرف اپنی زندگی سے تضاد کو دور کرنے کی دعوت

دی جاتی ہے اور ان کے اسلام کا انکار نہیں کیا جاتا بلکہ صرف یہ کہا جاتا ہے کہ جب تم نے توحید و رسالت کی شہادت دی ہے تو اپنی زندگی میں بھی اس کے تقاضوں کو نمایاں کرو ——— تو بعض متقی حضرات ہی بگڑ کر فرماتے ہیں کہ یہ خارجیت ہے ——— یعنی زندگی میں اسلام کے عناصر کو پیدا کرنے کی دعوت تو خارجیت ہے اور اس سے یکسر بے نیازی اسلام!! کیا خارجیت وہی ہے جسے کل تک وہابیت کہہ کر بدنام کیا جاتا تھا!

مسجد و خرابات!

پچھلے دنوں پنجاب کے "مسلمان" اخباروں میں اس بات پر کہرام مچا ہوا تھا۔ کہ جالندھر میں ایک سینما گھر ٹھیک مسجد کے قریب تعمیر ہو رہا ہے مسجد جہاں اللہ کا نام بلند ہوتا ہے۔ جہاں اللہ اکبر کی صدائیں گونجتی ہیں جہاں پروردگار حق کی بارگاہ میں سجدے ہوتے ہیں۔ اور تقویٰ و طہارت حاصل کرنے کے لئے فرزندان اسلام جمع ہوتے ہیں ——— ایسے مقدس مقام کے پاس ہی سینما جیسی ناپاک، فاسقانہ، بے حیائی سکھانے والی عیش و نشاط کے ہنگامے برپا کرنے والی عمارت بنائی جائے؟ یہ بات مسلمانوں کے ذوق اسلامی پر سخت گراں ہے اور بعض مسلمان جماعتوں نے ایجی ٹیشن بھی شروع کرنے کی دھمکی دی تھی تاکہ وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ کے خس و خاشاک کو سیلاب کی طرح بہا لے جائیں۔

مگر ذرا ان مسلمان اخباروں کے صفحات پر ایک نگاہ ڈالئے جہاں ایک طرف اسلام اسلام کی پکار بلند ہوتی ہے توحید الہٰی کے نغمے گونجتے ہیں۔ نظام اسلامی بر پا کرنے اور حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی تلقینیں شائع ہوتی ہیں۔ وہاں بالکل ان کے پہلو میں نیک پروین، شمع، ملکۂ مصر، ڈاکٹر کوئنس کی امر کہانی کے اعلانات بھی جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جن میں فرزندان اسلام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ آؤ عیش و نشاط کے ان شاہکاروں فسق و فجور کے ان فسانوں، ہوس ناکی کے ان درسوں کا مشاہدہ کرو۔ اور آنکھوں، کانوں، دلوں اور دماغوں کو گناہ میں آلودہ کرو ــــــ

سوال یہ ہے کہ مسجد کے پاس سینما گھر بننے میں اور اسلامیات کے پہلو میں سینما کے اشتہاروں کی اشاعت میں کیا فرق ہے۔

اگر وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ اس امر پر بھی روشنی ڈالیں تو کرم ہوگا۔

دھوکے کا ہوا

جب اسلامی تحریک کی طرف لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ آؤ خدا کے دین کو خدا کی زمین پر قائم کرنے کی کوشش کریں۔ تو علاوہ اور شکوک و شبہات کے جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں ہے ایک وسوسہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے ماضی قریب میں مختلف تحریکوں کو قبول کر کے اتنا دھوکا کھایا ہے کہ اب کسی نئی تحریک کو قبول کرتے ہوئے

انہیں ڈر لگتا ہے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ پھر ان سے دھوکا نہ ہو جائے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ یہی حضرات جنہیں اقامت دین کی تحریک میں شامل ہونے سے دھوکے میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے ہر روز نت نئی تحریکوں میں تن من دھن سے کودتے رہتے ہیں۔ حالانکہ دنیا کے اعتبار سے ان کی کامیابی مشکوک ہوتی ہے اور آخرت کے اعتبار سے ان کی ناکامی یقینی اور قطعی۔ مگر یہ دودھ کے جلے ہوئے چھاچھ تو پھونک پھونک کر پیتے ہیں مگر اوٹتے ہوئے اور کھولتے ہوئے دودھ کا پیالہ ہر بار جھٹ سے ہونٹوں کے ساتھ لگا لیتے ہیں۔ اور جب ان کے ہونٹ، ان کا منہ بلکہ ان کی انتڑیاں تک جل جاتی ہیں تو چھاچھ کو دیکھ کر اس سے بچتے ہیں کہ کہیں ان کے منہ کو نہ جلا ڈالے۔

مگر اس امر واقعہ سے قطع نظر سوال یہ ہے کہ دنیوی تحریکات تو مان لیا دھوکا ہی دھوکا ہیں مگر اقامت دین کی تحریک میں کیا دھوکا ہے۔ کیا خود کو بندگیٔ رب میں دیدینے میں دھوکا ہے۔ کیا کتاب و سنت پر عمل کرنے میں دھوکا ہے۔ کیا رضائے الٰہی کی طلب میں دھوکا ہے۔ اللہ کی اطاعت اور رسول کی پیروی میں دھوکا ہے؟ ——— کہیئے کس بات میں دھوکا ہے ——— نہیں بلکہ یہ شیطان کا دھوکا ہے کہ وہ دھوکے کا ہوا دکھا کر آپ کو اس کام سے روک دینا چاہتا ہے۔ جو فلاح دارین کا ضامن ہے بچنا ہے تو اس دھوکے سے بچیئے۔

انشاء اللہ کا نفیس استعمال

مسلمانوں کے ایک بنک کی طرف سے جس کا ہیڈ آفس بمبئی میں ہے۔ اور جس کا ایک دفتر لاہور میں بھی ہے، ایک اعلان اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ جس کی سطور ذیل خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔

"ہم مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ ——— بنک لمیٹڈ انارکلی برانچ کا افتتاح انشاء اللہ تعالیٰ ۲ر اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ہوگا۔ سب سے استدعا ہے کہ اس روز تشریف لاکر مشکور فرمائیں۔"

یعنی ایک ایسا کاروبار جس کی بنیاد سود پر ہے ——— وہ سود جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے رکھا ہے ——— اس کی شاخ انارکلی کا افتتاح بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ مشیت الٰہی کا یہ کتنا اچھوتا تصور ہے۔ اور انشاء اللہ کا یہ کتنا نفیس استعمال ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی کا ارتکاب اس کی مشیت کے مطابق کیا جا سکتا ہے انشاء اللہ تعالیٰ ہم فلاں روز چوری کریں گے۔ انشاء اللہ ہم ڈاکہ ڈالیں گے۔ انشاء اللہ ہم شراب پئیں گے۔ انشاء اللہ ہم سود کھائیں گے۔ اور انشاء اللہ ہم سودی کاروبار کا افتتاح کریں گے۔ ——— یہ ہے ہماری خدا پرستی کہ خدا کی نافرمانی بھی اس کی مشیت سے کی جاتی ہے۔

ہماری اس گستاخی پر پھر کوئی ع۔ف یا ع۔ق صاحب سرزنش

کریں گے۔ کہ تم مسلمانوں کو روٹی بھی کھانے دو گے یا نہیں۔ ان کو اپنی اقتصادی حالت درست بھی کرنے دو گے یا نہیں خدا خدا کر کے مسلمان بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں مگر تم ان پر طعن و طنز کے تیر برسانے لگے اور تنقید کے نشتر چلانے لگے ——
ہم نے کب کسی کو سود کھانے، شراب پینے اور فواحش میں مبتلا ہونے یا حرام ذرائع سے اپنی اقتصادی حالت درست کرنے سے منع کیا اور منع کریں تو مانتا ہی کون ہے۔ ہماری تو گزارش صرف یہ ہے کہ آپ کے جی میں جو آئے کیجئے مگر خدا کے لئے اللہ کی مشیت کو استعمال نہ کیجئے۔ جملہ "انشاء اللہ" تو ان کاموں کے لئے ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہوں۔

محرم کا سہل احترام

ایک صاحب اپنی انجمن کی طرف سے اعلان فرماتے ہیں کہ مسلمان دس یوم تک اپنے گھروں اور مکانوں میں ریڈیو نہ لگائیں اور اس طرح محرم الحرام کا احترام کریں۔
محرم الحرام کے احترام کا جذبہ دافراس خاص دینداری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ جو اس وقت ہماری قوم میں رائج ہے۔ سوال ریڈیو کے اچھے اور برے ہونے کا نہیں بلکہ محرم کے احترام کا ہے۔ حالانکہ اگر وہ اچھی شے ہے تو محرم کے ابتدائی دس دنوں نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کے اوقات اس شغل مبارک سے محروم رہیں۔ اور اگر بری

ہے تو پھر ان نا دن کی کیا قید ہے۔ اسے سال بھر بند رہنا چاہئے سب دن اللہ کے ہیں۔ برائی سب میں برائی ہے۔

محرم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے منسوب ہے یعنی ۶۱ھ میں جو محرم آیا تھا۔ اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے مقدس رفقاء شہید کر دیئے گئے تھے۔ لیکن اب سال بھر تو شہادت حسینؓ کا غم سویا رہتا ہے اور ہر محرم میں بیدار ہو جاتا ہے۔ گویا حسینؓ کی شہادت کی یاد صرف محرم میں آتی ہے۔ اس سے پہلے نہ حسینؓ شہید ہوتے ہیں نہ ان کی شہادت کا غم ہوتا ہے۔

آہ حسینؓ کربلا کی مظلومی! ——— جس نے ایک اصول کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اس کے لئے امت کے پاس صرف دس دن تک ریڈیو بند کر دینے کا تحفہ ہے۔ اور جس نے احترام آدمیت کی حفاظت کے لئے جان دیدی۔ اس کی قربانی کا صلہ یہ ہے۔ کہ جس مہینے میں وہ شہید ہوا۔ اس کے پہلے دس دن میں اس کے قدردان گانا نہیں سنیں گے۔ اور محرم کے احترام کا حق ادا ہو جائے گا ———

کتنا سستا ہے احترام کا طریقہ کتنا سہل ہے۔ شہادت حسین کا اعتراف۔ محرم گذرا اور پھر وہی ریڈیو۔ وہی نغمے اور وہی ارباب نشاط کی قدر افزائی ———

آہ حسین مظلوم!

جنگ کا زمانہ

یہ صحیح ہے کہ جنگ کے زمانہ میں غیر معمولی حالات کا سامنا ہوتا ہے۔ مگر انسانی اخلاق کی بنیاد تو نہیں بدل جاتی - یہ ہو سکتا ہے کہ زاہد محتسب بن کر لوگوں کے جام وسبو کو نہ چھوڑتا پھرے - مگر یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ خود خم کے خم لنڈھانے لگے - یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی غضِ بصر کی پوری حدود کو ملحوظ نہ رکھ سکے مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ عصمت و عفت کی چادروں کو بے تکلف تار تار کرتا پھرے -

جنگ صرف فرنگی تہذیب و اخلاق کے پیروؤں پر نہیں آئی۔ اسلامی اخلاق کے سرمایہ داروں پر بھی آئی تھی - قرآنی تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی عربوں کی ایک فوج شام کی ایک خوبصورت بستی میں فاتحانہ داخل ہوئی - مقامی عیسائی آبادی نے بام و در میں اپنے حسن و جمال کے تمام پیکروں کو دلفریبی و زیبائی کے تمام تیوروں سے آراستہ کر کے جاگزیں کر دیا - تاکہ عرب کے بے خبران حسن و ادا کو مسحور کر کے ڈال دیں اور جہاں رومی بہادروں کی شمشیر و کمان ان کو مسخر نہ کر سکیں - وہاں لعبتانِ حسن کا تیر نگاہ اور تیغ جلوہ ان کو مغلوب کر لے - جب پوری عربی فوج شہر سے گزر گئی تو ایک متعصب مسیحی نے مسلمان افسر سے پوچھا کہ کیا ایسے ہے یہاں کے سرمایہ

حسن وجمال کے متعلق ؟ ———— اس نے جواب دیا کہ کیسا حسن و جمال ؟ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں ہم تو اپنے پروردگار کے حکم کے مطابق نگاہیں پست کئے شہر میں نکلے چلے گئے۔ مسیحی نے یہ سنا تو دل میں کہا ان فرشتوں پر بازی لیجانا ناممکن ہے! یہ تھا جنگ کا زمانہ اور یہ تھا مسلمان قوم کا کردار !!

اسلام کی بنیادی تعلیمات !

زندگی میں دینی انقلاب پیدا کرنے والی کتب

دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات

یہ کتاب جماعت اسلامی کی پوری دعوت کا خلاصہ ہے تاکہ ایک طالب حق تھوڑے سے مطالعہ سے دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات کا اندازہ لگائے۔ اور وہ لوگ جو اس دعوت حق کو قبول کر چکے ہیں وہ تبلیغ حق کا فریضہ بھی ادا کر سکیں اور اس پیغام کو دوسروں تک پہنچا سکیں۔ یہ کتاب امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی و مولانا امین احسن اصلاحی کی تقاریر اور میاں طفیل محمد قیم جماعت اسلامی کے بصیرت افروز مضمون "دعوت اسلامی اور اس پر لبیک کہنے والوں کے فرائض" پر مشتمل ہے قیمت مجلد ۶ عہ

مسلمان کیا کریں؟

از مولانا سید نذیر الحق صاحب میرٹھی اس میں ہندستان کی پیچ در پیچ سیاست میں الجھ کر گھرے ہوئے مسلمانوں کو اپنے قول و فعل کا محاسبہ کرنے اور تحریک اسلامی کی طرف دعوت دیتے ہوئے نیز لادینی کو شکست دینے اور مسلمانوں کو غالب کرنے کا صحیح راستہ قرآن و سنت کی روشنی میں بتایا گیا ہے قیمت ۸؍

نظام اطاعت کی تین کڑیاں

از سید جعفر شاہ صاحب پھلواروی خطیب جامع مسجد کپورتھلہ اس میں بتایا گیا ہے کہ اطاعت کا مفہوم کیا ہے اور خدا اپنے بندوں سے کس قسم کی اطاعت کرانی چاہتا ہے قیمت ۸؍

ملنے کا پتہ

محمد شریف قریشی مہتمم مکتبہ دین و دنیا نزد تھانہ گوالمنڈی لاہور



اسلام کو جاہلیت سے ممیز کرنے اور غیر اسلامی عقائد
و اعمال کی اصلاح کا انقلاب انگیز سامان

اور

دین حق اور اس کی جزئیات کا حقیقت افروز مرقع

از

مولانا نصر اللہ خاں عزیز بی اے مدیر کوثر لاہور

مرتبہ

محمد شریف قریشی

مکتبہ دین و دنیا نزد تھانہ گوالمنڈی لاہور